اِنسانی اقدار

حسن الدین ہاشمی

اُردو مرکز، لاہور

اِنسانی اقدار

حسن الدین ہاشمی

اُردو مرکز ـــــ لاہور

بارِ اوّل ـــــــــ اگست ۱۹۶۹ء

طابع ـــــــــ ملک محمد عارف

مطبع ـــــــــ دین محمدی پریس لاہور

ناشر ـــــــــ اُردو مرکز، لاہور

قیمت ـــــــــ ایک رُوپیہ پچاس پیسے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

اِنسان کی زندگی کا مقصد پائیدار مسرت کا حصول ہے۔ اِس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے حقیقتِ اعلیٰ سے تعلق اور اِنسانی اقدار سے وابستگی شرط ہے۔ جو شخص اِن بُنیادی ارکان کو پا لے بِلاشبہ اُس کی زندگی کامیاب و کامران ہے اور جو انہیں نہ حاصل کرنے پائے وُہ یقیناً ناکام و نامُراد ہے۔

یہ دونوں ارکان، اِنسانی زِندگی کے دو ایسے بنیادی اجزا ہیں جن کی رعایت متوازن اور کامیاب زندگی کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ ایک طبقہ رُوحانیت کے نام پر مادی زندگی کی ضروریات کے متعلق نفرت کا سبق دیتا ہے اور دُوسرا طبقہ مادیّت اور اِنسانیت کے نام پر رُوحانیت سے اِنکار سِکھاتا ہے۔ نظریات میں انتہا پسندی کا یہ رُجحان، اِنسانی دکھوں کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ انتہا پسندی

بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے اور سطحی جذبات کو خوب اپیل بھی کرتی ہے مگر نتائج کے اعتبار سے تباہ کن ہوتی ہے۔ درمیانی راہ ذرا مشکل ہوتی ہے اور جنونی جذبات کو اپیل بھی نہیں کرتی مگر آخر کار مفید یہی ثابت ہوتی ہے اور کامیابی و کامرانی اسی پر چلنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

دُنیا کی تاریخ بہت طویل ہے۔ اس میں عجیب و غریب حادثات کی کوئی کمی نہیں۔ دورِ حاضر کا عظیم حادثہ، مادیت پرستی کا غلبہ ہے جس نے خُدا پرستی کا انکار کر کے دلکش نعروں کے نام پر انسانیت کا بے دریغ خون بہایا۔ ایک طرف مزدور آمریت کے نام پر شخصی آزادیوں کو کچل دیا گیا اور ایسا جابرانہ نظام مسلط کیا گیا جس میں برسرِ اقتدار ٹولہ اور اس کے قصیدہ خوانوں کو تو ہر طرح کی آسائشیں اور سب کچھ کہنے اور کرنے کی چھٹی مل گئی مگر دوسروں کو ایک بے زبان جانور بنا رہنے پر مجبور کر دیا گیا اور اگر کسی نے مخالفت میں زبان کھولنے اور آزادی کا سانس لینے کی جرأت کی تو اُس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ دُوسری طرف جمہوریت اور آزادی کے نام پر سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو بے لگام چھوڑ دیا گیا کہ وُہ جس قدر، جن ذرائع سے اور جس انداز میں دولت بٹورنا چاہیں بٹور لیں، غریبوں کا جینا دُوبھر کر دیں، مزدوروں اور کسانوں کا خُون نچوڑ لیں کوئی پُوچھنے والا نہیں۔

یہ دونوں نظام اگرچہ اپنے طرزِ فکر و عمل میں ایک دُوسرے سے جُدا ہیں مگر مادیّت پرستی اَور اِنتہاپسندی میں کم و بیش دونوں ہی یکساں ہیں اِسی طرح دونوں ہی اِنسانی قدروں کو سربلند کرنے کا نعرہ لے کر اُٹھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وُہ اِنسانی اقدار کے نام پر اپنی اِنتہاپسندی کی پُوجا کر رہے ہیں۔ اِنسانیت ان کے نزدیک ثانوی چیز ہو کر رہ گئی ہے۔ پہلے درجے پر ان کے لئے اپنے انتہاپسندانہ نظاموں کا قیام و بقا ہے خواہ اس کے لئے انہیں اِنسانیت کا کِتنا ہی خُون بہانا پڑے۔

جب یہ دونوں فریق اِنسانیت کی خدمت جیسا نیک جذبہ لے کر اُٹھے ہیں تو پھر یہ سیدھی پٹڑی سے کیوں کر ہٹ گئے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے حقیقتِ اعلیٰ پر ایمان اَور اس کے تعلق سے کنارہ کشی اِختیار کر لی اِشتراکیوں نے کھلم کھلا ذاتِ احدیّت کا اِنکار کر دیا۔ اَور جمہُوریّت پسندوں کی اکثریّت نے اِس پر ایمان کے باوجود اس کے تعلق کو پسِ پُشت ڈال دیا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اِس جواب سے کِتنی ہی پیشانیوں پر نفرت کے باعث بَل پڑ جائیں گے۔ مگر وہ وقت دُور نہیں جب یہی نفرت، ندامت میں بدل جائے گی۔

میں نے اِس کتاب میں صِرف اِنسانی اقدار کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب دونوں فریقوں کے لئے دعوتِ فکر ہے۔ اُنہیں چاہیئے کہ ٹھنڈے دل و

دماغ سے پہلے تو ان قدروں پر غور کریں جو اِنسانی مفاد کی ضامن ہیں اور پھر اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر بتائیں کہ جس فِکر و عمل سے وُہ چمٹے ہوئے ہیں کیا اُسے اِنسانی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیا جا سکتا ہے؟

یہ کتاب جسے اِنسانی اقدار کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے میری منتشر تحریروں کا مجموعہ ہے جن میں سے کچھ پہلے شائع ہو چکی ہیں اور بعض شائع نہیں ہوئیں۔ میں نے دسمبر ۱۹۶۸ء میں ان پر نظر ثانی کی اور اس دوران جہاں جہاں مناسب سمجھا ان میں ترمیم بھی کی۔

حسن الدین

۶۔ فروری ۱۹۶۹ء

نصب العین

میرا نصب العین مقدس اقدار کی تبلیغ و اشاعت اور انسانیت کی بے لوث خدمت ہے۔ یہ ایک نہایت ہی عظیم مقصد ہے جسے لے کر میں زندگی کے ایک نئے دَور میں داخل ہو رہا ہوں۔ اپنے عزائم کی تکمیل میں جن دُشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا مجھے اُن کا احساس ہے۔ وُہ کانٹے میری نگاہ میں ہیں جو مجھے پھولوں تک پہنچنے سے روکیں گے۔ وُہ چٹانیں مجھے نظر آ رہی ہیں جو میری راہ میں حائل ہوں گی مگر مجھے اپنی منزل تک پہنچ کے چین لینا ہے۔ اپنے محبوب مقصد کی راہ میں بچھے ہوئے کانٹوں کو پھولوں کی سیج سمجھوں گا اور رکاوٹ پیدا کرنے والی چٹانوں کو سمندِ شوق کی مہمیز تصوّر کروں گا۔ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے اور ضرور پہنچنا ہے۔ دُنیا کی کوئی طاقت میری راہ نہیں روک سکتی۔

ترجمانِ حقیقت

جنوری ۱۹۶۳ء

میثاق

[یہ تقریر یکم جنوری ۱۹۶۳ء کو گارڈینیا ہوٹل شاہراہِ قائدِ اعظم لاہور
میں ماہنامہ ترجمانِ حقیقت" کے افتتاح کے موقعہ پر کی گئی۔]

معزز حاضرین! آپ کی تشریف آوری اور حوصلہ افزائی کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں جس ماہنامہ کے افتتاح کے سلسلے میں آج آپ یہاں تشریف لائے ہیں وہ کوئی تجارتی انداز کا ماہنامہ نہیں بلکہ تحریکِ خلّت یعنی انسانیت دوستی کا پیامبر ہے۔ اس پاکیزہ مقصد میں یہ کہاں تک کامیاب ہوتا ہے اس کا جواب تو مستقبل ہی دے گا۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں مستقبل سے بہت پُر اُمید ہوں کیونکہ مقدس اور پاکیزہ اقدار کا تقدس ان کی کامیابی و کامرانی کا ضامن ہوا کرتا ہے اس لئے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرات! جس کام کا میں نے بیڑا اُٹھایا ہے وہ کوئی میرا شخصی کام نہیں بلکہ اس کا تعلق ہر اُس فرد سے ہے جو نوعِ انسان سے تعلق رکھتا ہو۔ اس لئے اگر میں یہ کہہ دوں کہ یہ تمام انسانوں کا مشترکہ کام ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

انسانیت جس ظلم و ستم کی چکّی تلے پس رہی ہے ضرورت ہے کہ اسے اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی مؤثر قدم اُٹھایا جائے اور موجودہ حالات میں اس کا یہی بہتر اور مؤثر طریقہ ہے کہ مقدس اقدار کی تبلیغ و اشاعت کی جائے اور ان تمام نظامہائے

افکار کی نقاب کشائی کی جائے جو انسانیت کے حق میں زہرِ قاتل ہیں۔ آج کے علمی دَور میں جاندار اور پائندار اصلاح کی بہترین صورت یہی ہے کہ افکار میں انقلاب پیدا کیا جائے اِس میں دیر ضرور لگے گی مگر "دیر آید درست آید" کی حقیقت سے اِنکار نہیں کیا جا سکتا۔

میرے ہم سفرو! آج کا دن جہاں نئے سال کے آغاز کا دن ہے وہاں میری زندگی کے ایک نئے دَور کی ابتدار کا دن بھی ہے۔ آج میں آپ کے سامنے یہ وعدہ کرتا ہُوں کہ میری بقیۂ زندگی مُلّت کے پرچار کے لئے وقف ہوگی۔ میں یہ اچھی طرح جانتا ہُوں کہ کسی بھی عظیم کام کا بیڑا اُٹھاتے وقت سرکش طاقتوں کی پیدا کردہ مصائب و تکالیف سے ضرور سامنا ہوتا ہے۔ میں اپنی ہزار کمزوریوں کے باوجود اِس مقابلہ کے لئے تیار ہوں اور نہایت عجز و انکسار سے اپنے یہ الفاظ دُہراتا ہُوں کہ اپنے محبوب مقصد کی راہ میں بچھے ہوئے کانٹوں کو پھولوں کی سیج سمجھوں گا۔ اور رکاوٹ پیدا کرنے والی چٹانوں کو سمندِ شوق کی مہمیز تصوّر کروں گا۔ مجھے منزلِ مقصود تک پہنچنا ہے اور ضرور پہنچنا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت میری راہ نہیں روک سکتی۔

ترجمانِ حقیقت

فروری ۱۹۶۳ء

مذہب اور تلوار

کوئی سچّا دین کبھی بھی بزورِ شمشیر پھیلنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ اپنی صداقت کے سہارے دِلوں کی پہنائیوں میں اترتا ہے۔ تلوار کے ذریعے صرف ایسے ہی مذاہب پھیلنے کی کوشش کرتے ہیں جن میں صداقت کا پہلو تاریک ہوتا ہے۔ ان مذاہب کا عرصۂ حیات مختصر ہوتا ہے جب تک تلوار سامنے رہے ایک مختصر سا ٹولہ ان کا دم بھرتا رہتا ہے۔ تلوار کے غائب ہوتے ہی یہ بھی پردۂ عدم میں چلے جاتے ہیں جن مذاہب کی دیواریں جبر و تشدّد پر چنی جاتی ہیں وُہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتے کیونکہ گردن کی اطاعت دل تک رسائی نہیں حاصل کر سکتی۔ اور جب تک دل میں کسی مذہب کی اطاعت کا جذبہ نہ پیدا ہو اس سے شیفتگی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور جس مذہب کے پیروؤں کو اُس سے شیفتگی نہ ہو وُہ کبھی پروان نہیں چڑھ سکتا۔ صرف وُہی مذاہب ترقی کرتے ہیں جن کی عمارت حق و صداقت کی بنیاد پر قائم ہو کیونکہ اُن کا ٹھکانا دِل کی گہرائیوں میں ہوتا ہے اور دل کی اطاعت پُورے بدن پر حاوی ہو جاتی ہے۔ چونکہ دل کے پاس عقل کی کسوٹی بھی ہوتی ہے اِس لئے جھُوٹے مذاہب کبھی ادھر کا رُخ نہیں کرتے۔ جس مذہب کو اپنی صداقت پر پُورا یقین ہوتا ہے وُہ بلا تامُّل ہر کسی کو دعوت دیتا ہے کہ مجھے عقل

کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لو پتا چل جائے گا کہ کھوٹا ہوں یا کھرا۔ مگر جن مذاہب میں صداقت نہیں ہوتی وُہ عقل کے نام تک سے گھبراتے ہیں۔

ترجمانِ حقیقت

فروری ۱۹۶۳ء

وحدتِ انسانیّت

نوعِ انسان کے تمام افراد ایک ہی جسم کے مختلف اعضاء ہیں اور کِسی جسم کی صحت و سلامتی اس کے تمام اعضاء کی صحت و سلامتی پر منحصر ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ ہر "کُل" اپنے اجزاء سے بنتا ہے۔ اگر سب اجزاء یا بعض اجزاء کا وجُود ختم کر دیا جائے تو یہ دراصل اسی "کُل" کو ختم کرنا یا ناقص بنانا ہوگا جس کے یہ اجزاء ہیں پس "کُل" اُسی وقت صحیح و سالم ہو سکتا ہے جب کہ اس کے سب اجزاء صحیح و سالم ہوں۔ پھر جب کِسی بھی جُزو کے عیب دار ہونے سے کُل عیب دار ہو جاتا ہے اور اِدھر کُل نام ہوتا ہے اپنے اجزاء کے مجموعہ کا تو کسی بھی جُزو کے عیب دار ہونے سے تمام اجزاء عیب دار ہو جائیں گے۔

اِس عیب داری کا اِحساس ہر فرد کو اپنے انفرادی جسم کے متعلق ضرور ہوتا ہے۔ کیا کوئی ہاتھ اپنے جِسم کی آنکھ نِکلنے پر خوشی منا سکتا ہے؟ نہیں، بلکہ آنکھ کو تکلیف پہنچے تو ہاتھ مضطرب ہو جاتا ہے اور ہاتھ کو تکلیف پہنچے تو آنکھ اشکبار ہو جاتی ہے۔ آنکھ کا عیب دار ہونا ہاتھ کا عیب دار ہونا ہے اور ہاتھ کا عیب دار ہونا آنکھ کا عیب دار ہونا کیونکہ یہ ایک ہی جِسم کے مختلف اعضاء ہیں۔ اِس لئے ہر ایک کا دُکھ دُوسرے کا دُکھ اور ایک کا نقصان دوسرے کا نقصان ہے۔ ہاتھ، آنکھ، کان،

ناک کی طرح ہر انسان بھی جسمِ انسانیت کا ایک عضو ہے۔ ضرورت اِس امر کی ہے کہ جس طرح ہر اِنسان میں یہ اِحساس ہوتا ہے کہ اس کے کسی ایک عضو کے کٹنے سے سارا انفرادی جسم عیب دار ہو جائے گا اسی طرح اس میں یہ احساس ہونا بھی ضروری ہے کہ اجتماعی جسم کے کِسی ایک حِصّے کے کٹنے سے بھی سارا اجتماعی جِسم عیب دار ہو جاتا ہے۔ یہ اِحساس اِس لئے ضروری ہے تاکہ ہر فرد اجتماعی جسم کے ہر عضو کی بھی اتنی ہی عزّت و حفاظت کرے جتنی کہ انفرادی جسم کے اعضاء کی کرتا ہے۔ یہ کس قدر ظلم ہے کہ ایک اِنسان دُوسرے کے قتل پر مسرّت محسُوس کرتا ہے، ایک اِنسان دُوسرے کا خون چُوستا ہے، ایک اِنسان دُوسرے کی دُنیا تاریک کر دیتا ہے، ایک انسان اپنی مسرّت کی خاطر دُوسرے کی مسرّتیں چھین لیتا ہے وُہ کیوں غور نہیں کرتا کہ دُوسرے اِنسان کو دُکھ پہنچا کر وُہ اپنے بلکہ سارے عالمِ انسانیت کو دُکھ پہنچا رہا ہے۔ اگر آنکھ، ہاتھ کے دُکھ پر اشکبار ہو جاتی ہے تو ایک اِنسان دُوسرے اِنسان کے دُکھ پر کیوں اشکبار نہیں ہوتا؟ جب ایک عضو دُوسرے عضو کو غلام نہیں بناتا تو ایک اِنسان دُوسرے اِنسان کو کیوں غلام بنا لیتا ہے؟ اگر دانتوں کی سفیدی، پُتلی کی سیاہی سے نفرت نہیں کرتی تو گورا انسان، کالے اِنسان سے کیوں نفرت کرتا ہے؟

مختلف اِنسانی تہذیبوں کا مطالعہ کرنے سے یہ چیز سامنے آتی ہے کہ کہیں تو بچّے کو ہوش سنبھالتے ہی ماں باپ نے یہ تعلیم دینی شروع کی کہ بیٹا کالے لوگ

بہت بُرے ہوتے ہیں، کمینے، غدّار، دھوکے باز اور بے وفا ہوتے ہیں۔ ان سے تعلّقات رکھنا، انہیں اپنے ہوٹلوں میں کھانا کھانے دینا، اپنے کالجوں میں داخل ہونے دینا، اپنے گرجاؤں میں آنے دینا ایک بدترین پاپ ہے۔ گلی کے ہمسایہ، بازار کے دکاندار، گرجا کے پادری نے بھی یہی کہا۔ بچے نے اسی کا یقین کر لیا اور کہیں بچّے کو ماں باپ اور ماحول نے بتایا کہ فلاں قوم پلید ہے اِس لئے اس کے کِسی فرد کو قریب نہیں پھٹکنے دینا چاہیئے۔ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جائے وُہ پلید ہو جاتی ہے اُسے نہیں کھانا چاہیئے۔ اگر اس کے کان میں مقدس کتاب کی آواز پڑ جائے تو اُس کے کانوں میں پگھلا ہُوا سیسہ بھر دینا چاہیئے۔ ان پلید کانوں نے مقدّس کتاب کیوں سُنی۔ اِس تاریک ماحول میں پروان چڑھنے والے بچّوں نے بڑے ہو کر خوب مشقِ ستم کی، گوروں نے کالوں کو نشانۂ ستم بنایا تو نام نہاد بزرگ قوم والوں نے حقیر قوم والوں کو تختۂ مشق بنایا۔ کس قدر بھیانک ہے یہ ماحول جس میں اِنسانوں نے غیر اِنسانی حرکات کو سینے سے لگا لیا، مختلف افراد اور طبقے اِنسانی ہمدردی کو چھوڑ کر صرف اپنے مفاد کی سوچنے لگے خواہ اس کے حصُول کے لئے اُنہیں دُوسروں کی زندگی ہی کیوں نہ برباد کرنی پڑے۔ نظریاتی گروہوں نے اپنے سے اختلاف رکھنے والوں کے جان و مال اور عزّت و آبرو کو تباہ کرنا کارِ ثواب سمجھ لیا۔ اِس تنگ نظری اور ظالمانہ طرزِ عمل نے ساری دنیا میں تباہی مچا رکھی ہے، اِنسانیت کا بُری طرح خُون ہو رہا ہے اور ہزاروں بے گناہ ظلم

کی نذر ہو رہے ہیں۔

اب خُلّت کے پیروکاروں کو کیا کرنا چاہیئے؟ ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ لوگوں کو اِنسانیت کا بھُولا ہوا سبق یاد دلائیں، ان میں وحدتِ اِنسانیت کی تبلیغ کریں۔ گورے کو سمجھائیں کہ کالا بھی اِنسان ہے تو اس سے برتر نہیں۔ نام نہاد بزرگ قوم والے کو سمجھائیں کہ چھوٹی قوم والا بھی اِنسان ہے تو اس سے افضل نہیں۔ بے حد ضروری ہے کہ اَن تھک کوششوں سے غلط نظریات کی کڑی زنجیروں کو ایک ایک کر کے توڑ پھینکا جائے تاکہ انسانیت سوز داستانوں کا سلسلہ بند ہو سکے۔

اب تاریک سے تاریک خطّوں میں بھی روشنی کی کرنیں پھُوٹنے لگی ہیں اِس لئے اب وُہی تحریک کامیاب ہو سکے گی جس کی آخری منزل اِنسانوں کی حقیقی مساوات ہوگی۔ اِس لئے خُلّت کے پیروکاروں کو اپنے حوصلے بلند رکھنے چاہئیں۔ ان کی منزل قریب ہے۔ طبقاتی و علاقائی اَور رنگ و نسل کے تعصّبات پر جینے والوں کی زندگیوں کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ اب انہیں حقیقت پسندی سے کام لینا چاہیئے۔ ان کی طاقت کے شکنجوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی ہے۔

کِس قدر غلطی پر ہیں وُہ لوگ جو طاقت کے نشہ میں چُور ہو کر اِنسانوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیا وُہ نہیں سوچتے کہ مستقبل کی بیدار دُنیا اُنہیں کِن القاب سے پکارے گی؟ کیا وُہ یہ بھُول جاتے ہیں کہ آنے والا مؤرّخ اُنہیں کبھی نہیں معاف کرے گا؟ کیا ماضی کے انسانیت دُشمنوں

کی زندگیوں میں ان کے لئے کوئی درسِ عبرت نہیں؟ انہیں ماضی کی تاریخ
سے سبق لینا چاہیئے۔

آزادی اور جمہوریت

کسی بات کے خیر و شر ہونے کا دار و مدار اس کے نتائج پر ہوتا ہے۔ اگر نتائج اچھے ہوئے تو اس بات کو خیر شمار کیا جائے گا اور اگر بُرے ہوئے تو اُسے شر کہا جائے گا۔ مگر خود نتائج کے اچھا بُرا ہونے کا دار و مدار کس چیز پر ہے؟ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ دنیا کی کسی بھی چیز کا اچھا یا بُرا ہونا دراصل مفادِ انسانی پر موقوف ہے۔ اگر کوئی چیز انسانوں کے حق میں مفید ہے تو اسے خیر کہا جائے گا اور اگر مضر ہے تو اسے شر کہا جائے گا۔ دُنیا بھر کے تمام مقدس اصولوں میں یہی بنیادی حقیقت کارفرما ہے۔

آج سب لوگ آزادی کو اچھا اور غلامی کو بُرا سمجھتے ہیں یہاں بھی وہی حقیقت کارفرما ہے کہ آزادی مفید اور غلامی مضر ہے۔ مگر آزادی ہے کیا چیز؟ اس سے ہمیں کیا فائدہ پہنچتا ہے؟

آزادی کا مفہوم

لفظ آزادی کا لغوی مفہوم تو یہ ہے کہ افکار، اقوال اور افعال کا تمام پابندیوں سے مبرّا ہونا۔ اگر ہم آزادی کا یہ وسیع مفہوم مراد لیں تو اس معنی کی رُو سے تو کوئی فرد آزاد نہیں اور نہ ہی ایسی آزادی کسی کو حاصل ہونی چاہیے کیونکہ یہ آزادی کوئی قابلِ

ستائش وصف نہیں بلکہ درندگی کا دُوسرا نام ہے۔ اِس سے ہر صاحبِ اقتدار فرد یا قوم کے لئے دُوسروں کا خُون اَرزاں ہو جائے گا اور لکھوکھا اِنسانوں کی آزادیاں خاک میں مِل جائیں گی بلکہ ان کی اپنی آزادی بھی ناپائیدار ثابت ہوگی کیونکہ کب تک وُہ دُوسروں کو اپنے تشدّد کا نشانہ بناتے رہیں گے آخر ایک نہ ایک دن مظلوم طبقہ ضرور بغاوت پر اُتر آئے گا اور پھر ان کے دلوں میں ظالموں پر رحم کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ لہٰذا کِسی کو بھی ایسی آزادی حاصِل نہیں ہونی چاہیئے جو امن کا شیرازہ منتشر کر کے اِنسانوں کی زندگیاں خطرہ میں ڈال دے۔

جب ہم آزادی کو اِنسان کا بنیادی حق بتاتے اور اس کی تعریف میں رطب اللّسان ہوتے ہیں تو اس سے ہماری مراد مذکورہ بالا مفہوم نہیں ہوتا بلکہ اس وقت ہم آزادی کے معنی لیتے ہیں "روشن خیال اِنتخاب" یا "مفید انتخاب" یا "افادی انتخاب" یعنی ایسا اِنتخاب جو ہر فرد کو ترقی کے مواقع بہم پہنچائے اور اس کی حد وہاں پر جا کر ختم ہو جائے جہاں سے دُوسرے فرد کی حد شروع ہوتی ہے پس جب بھی کوئی انسان کِسی نظریہ یا قول یا فعل کا اِنتخاب کرتا ہے تو ہم اِس اِنتخاب کو اسی وقت آزادی سے تعبیر کریں گے جب کہ یہ کِسی دُوسرے کے حقِ اِنتخاب کو پامال نہ کرتا ہو ورنہ یہ آزادی نہیں ظلم ہوگا کیونکہ دُوسرا بھی اِنسان ہی ہے اور اُسے بھی ایسا ہی حقِ اِنتخاب حاصِل ہے جیسا پہلے کو۔

ہر دَور میں صاحبِ قوّت لوگ چلے آئے ہیں جو اپنے اِنتخاب کے دائرے

کو وسیع کرتے رہے۔ اور اس بات کی پرواہ نہ کی کہ ہمارے دائرۂ انتخاب کی وسعت سے دوسروں کا دائرۂ انتخاب سکڑتا چلا جا رہا ہے۔ اسی دھاندلی کے ردِ عمل میں لوگوں کو قانون[1] کا دامن تھامنا پڑا جس سے ریاست معرضِ وجود میں آگئی۔ ریاست سے مقصود تو ہوتا ہے لوگوں کے حقوق میں مساوات پیدا کرنا مگر عموماً ریاست میں بھی فوری طور پر وہی طبقہ برسرِ اقتدار آجاتا ہے جن کے ردِ عمل میں ریاست معرضِ وجود میں آئی تھی۔ اس سے آمریت اور ملوکیت کی ابتدا ہوتی ہے اور ظلم کی چکی پہلے سے زیادہ تیز اور منظم طریقہ پر چلنے لگتی ہے۔ اس ظالمانہ انداز کے ردِ عمل میں مظاہرے اور بغاوتیں ہوتی ہیں تب جا کر کہیں عوام کی حاکمیت تسلیم کی جاتی ہے اور جمہوریت کی داغ بیل ڈلتی ہے۔ آج جمہوریت کا جو بودا پن نظر آ رہا ہے

---

[1] قانون کا وجود آزادی کے منافی نہیں بلکہ قانون کی روح تو یہ ہے کہ ہر فرد کو اپنی حدود میں مکمل حقِ انتخاب حاصل رہے اور کوئی کسی کے حدود کی خلاف ورزی نہ کرنے پائے۔ قانون اس وقت آزادی کے منافی ہوتا ہے جب کہ قانون ساز، قانون کی روح کے برعکس قانون سازی کرے اور ہر فرد کے حقوق کے تحفظ کی بجائے کسی خاص شخص یا گروہ کا مفاد پیشِ نظر رکھے۔

بعض اوقات وہ قانون بھی آزادی کو نقصان پہنچانے کا باعث بن جاتا ہے جو اگرچہ بنایا گیا تو روح قانون ہی کے مطابق ہو مگر اس کا استعمال غلط ہو رہا ہو۔ (حسن)

اُسے پروان چڑھانے میں اُن گمنام ہستیوں کا بہت بڑا حصّہ ہے جنہوں نے اسے اپنے خون سے سینچا اور خود ہمیشہ کے لئے گمنامی کے غاروں میں چلے گئے۔

جمہوریّت

آج کل دُنیا میں مختلف نظامِ حکومت رائج ہیں مگر سب سے بہترین، جمہوریّت ہے جس میں عوام کی اکثریت کے منتخب نمائندے ایک خاص عرصے کے لئے ملکی نظم و نسق سنبھالتے ہیں۔ ان کے برسرِ اقتدار رہنے کی مدت کا تعیّن اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ غیر معیّن مدت کا اقتدار، حکمران طبقہ میں آمریّت کے جراثیم پیدا کر دیتا ہے جس سے عوام کی زندگیاں بے اطمینانی کا شکار ہو جاتی ہیں۔

جمہوری نظام میں حقیقی اختیارات عوام کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور تمام افراد کو یکساں بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ ہر فرد حقِ انتخاب و نمائندگی سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ ہر ایک کو معاشی، مذہبی، سیاسی اور اظہارِ خیال کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

آج سوائے چند ایک کے دُنیا کے تمام ممالک میں جمہوری نظامِ حکومت رائج ہے مگر ایک جمہوری ملک کا نظام دُوسرے جمہوری ملک کے نظام سے مختلف ہے۔ امریکہ و پاکستان کا صدارتی، برطانیہ و ترکی کا پارلیمانی اور رُوس اور چین کا اشتراکی کم و بیش سبھی جمہوری نظام ہیں مگر صدارتی جمہوریّت جس قسم کی امریکہ میں ہے پاکستان میں نہیں۔ پارلیمانی جمہوریت جس قسم کی برطانیہ میں ہے ترکی میں نہیں اور اشتراکی جمہوریّت جس قسم کی رُوس میں ہے چین میں نہیں۔ اس

اختلاف کی وجہ ان ممالک کے مخصوص حالات ہیں۔

بعض لوگ کسی دَور یا کسی ملک میں ایک خاص نظامِ حکومت کے کامیاب ثابت ہونے سے اِس غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ اِس نظام کی ذات ہی میں کامیابی بھری پڑی ہے لہٰذا ہر ملک کے مخصوص حالات کو دیکھے بغیر بھی اسے جس ملک اور جس دَور میں نافذ کیا گیا یہ وہاں کامیابی سے ضرور ہمکنار ہو گا لہٰذا اس سے چمٹے ہی رہنا چاہیئے۔ حالانکہ تلخ تجربات سے یہ مفروضہ غلط ثابت ہوُا ہے۔

جو ملک معاشی طور پر کمزور، تعلیمی طور پر پس ماندہ اور سرحدی طور پر دشمنوں میں گِھرا ہوُا ہو وُہ کسی مستحکم حکومت کا متقاضی ہوتا ہے جو اپنے تعمیری و ترقیاتی پروگراموں کو یکسُوئی کے ساتھ سرانجام دے کر ملک کو جلد سے جلد طاقتور اور ترقی یافتہ بنا دے۔ آج جن دو جمہُوری نظاموں کی طرف نگاہیں اُٹھتی ہیں ان میں ایک تو صدارتی نظام ہے دوسرا پارلیمانی۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ پارلیمانی نظام میں حکومت کو اِستحکام حاصل نہیں ہوتا۔ کِسی وقت بھی حکومت کے ٹوٹ جانے کا خطرہ موجود رہتا ہے جس کے نتیجے میں ترقیاتی کاموں پر عمل درآمد میں بڑی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں مگر صدارتی نظام میں حکومت مستحکم ہوتی ہے۔ وُہ آسانی سے عظیم ترقیاتی منصوبے بنا سکتی اور انہیں پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتی ہے اِس لئے اِس میں کچھ شک نہیں کہ ترقی پذیر ممالک کے لئے صدارتی نظام ہی قابلِ عمل ہو سکتا ہے۔

جہاں تک پارلیمانی نظام کی خوبیوں کا تعلق ہے تو ان سے انکار ممکن نہیں

لیکن اس کے نفاذ سے پہلے ایسے حالات پیدا کرنا ضروری ہیں جن میں وُہ کامیابی سے چل سکے۔ ان حالات کے بغیر اس نظام کو نافذ کر دینا بالکل ایسا ہے جیسے بلّیوں کے نرغے میں کسی بے بال و پر پرندے کو قفس سے باہر نکال دینا۔ پنجرے سے نکلنے میں یقیناً آزادی ہے مگر یہ آزادی مفید نہیں مُضر ہے۔ قفس میں اگرچہ آزادی نہیں مگر زندگی تو ہے اور پنجرے سے باہر تو موت ہی موت ہے۔ پس عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ پرندے کے بال و پر اُگنے دیئے جائیں پھر قفس کا دروازہ کھولا جائے۔

پارلیمانی نظامِ حکومت ایک بہتر نظام ہے مگر اِس کے لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ پہلے ملک کی معاشی، اقتصادی، تعلیمی، علمی اور دفاعی حالت کو بہتر بنایا جائے پھر اسے نافذ کیا جائے ورنہ تو خود غرض جاہ پرست قسم کے سیاستدان عوام کی غربت اور جہالت سے ناجائز فائدہ اُٹھا کر پُورے ملک کو اپنی ہنگامہ آرائی کا اکھاڑا بنا لیں گے جس کے نتیجے میں ایک طرف تو عوام مصائب کا شکار ہونے لگیں گے دُوسری طرف ملکی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

عبُوری نظام

مگر یہ حقیقت نہیں بھُولنی چاہیئے کہ مکمّل جمہُوریّت اور آزادی کے حصُول سے پہلے تمام نظام ہائے حکومت عارضی اور عبُوری ہوں گے انہیں تادیر نافذ رکھنے کی کوشش بہت بُرے نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ جو حکمران ماضی کے حالات کے

پیشِ نظر ـــ جو کہ وقت گذرنے کے ساتھ تبدیل ہو چکے ہیں ـــ حال میں بھی عبوری نظام قائم رکھنے کا جواز ڈھونڈتے ہیں۔ وُہ دراصل ایسے جذبات کے جنم پانے کا سبب بنتے ہیں جن سے عوام کا پیمانۂ صبر چھلک جایا کرتا ہے اس لئے عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اِن بدلتے ہوئے حالات کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور کسی بھی دور میں کوئی نظام نافذ کرتے وقت حالاتِ حاضرہ کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کا ضرور خیال رکھا جائے۔

ترجمانِ حقیقت

مارچ ۱۹۶۳ء

ذہنی آزادی

آزادی دو طرح کی ہوتی ہے۔ گردن کی آزادی اور ذہن کی آزادی۔ گردن کی آزادی تو جلد ہی حاصل ہو سکتی ہے مگر ذہن کی آزادی کے لئے ایک لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے جس میں نہایت تدبر و دانش مندی سے ان سب تدابیر کو بروئے کار لانا پڑتا ہے جو ذہن سے قدیم آقاؤں کی سرداری کے تمام نقوش محو کرنے میں معاون و مددگار ہوں۔

دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سا جذبہ اور مقصد ہوتا ہے جو گردنوں کو آزاد کرانے کی لگن پیدا کرتا ہے؟ غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جو چیز غلاموں کو اپنے آقاؤں کے خلاف ابھارتی ہے وہ ہے ان کی پس ماندگی، زبوں حالی، ترقی و استقلال سے محرومی کا احساس اور خوشحالی و خود مختاری جیسے مقصدِ عظیم کے حصول کا جذبہ۔ وہ جانتے ہیں کہ جب تک ہماری گردنیں ان آقاؤں کے شکنجے میں جکڑی رہیں گی ترقی و استقلال کی راہیں ہم پر نہیں کھل سکتیں۔ لہٰذا جس طرح بھی ہو سکے ان شکنجوں کو توڑ پھینکنا چاہیئے تاکہ بھکاریوں کا ایک ذلیل ٹولہ بننے کی بجائے ہم بھی دوسری آزاد اقوام کی طرح ایک آزاد اور مستقل قوم بنیں اور اپنے لئے وہ نظامِ زندگی اختیار کریں جو ہمارے مزاج کے موافق

اُور ہماری ترقی کا ضامن ہو۔ بھک منگوں کی طرح ہر وقت دوسروں کے رحم و کرم پر جینے اُور ان کے سہارے پلنے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر اپنی عزّتِ نفس کو بچائیں اُور یہ جبھی ہو سکتا ہے کہ ہم پر ہماری اپنی ہی حکومت ہو۔ اِس مقصدِ عظیم کی خاطر سر فروش قومیں ہزاروں قربانیاں دے کر اپنی گردنوں سے غلامی کا جوٴا اُتار پھینکتی ہیں۔

اب مرحلہ آتا ہے اِس آزادی کو برقرار رکھنے اُور اس مقصدِ عظیم کو حاصل کرنے کا جس کی خاطر یہ آزادی حاصل کی گئی تھی۔ اس کے لئے ضرورت ہوتی ہے ذہنی آزادی کی، کیونکہ غلام ذہن، آزادی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ اِس کے متعلق بجا طور پر ہر وقت یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ وُہ کہیں کسی دُوسرے آقا کی غلامی کا پھندا گلے میں نہ ڈال لے اور اگر رسمی طور پر آزادی کو برقرار رکھ بھی سکا تو آزادی کے مقصد کو حاصل نہیں کر سکے گا جس سے آزادی بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

غور کیجئے اگر آزادی کے بعد بھی کوئی قوم اپنے سابق آقاؤں ہی کی پالیسیوں پر چلنے کی پابند ہو، انہی کے اشارے پر اِس کی ہر حرکت ہو، انہی کا سبق اس کے وردِ زبان ہو تو یہ قوم خوش حالی، ترقی واِستحکام اُور عزّتِ نفس کی دولت سے کس طرح بہرہ ور ہو سکتی ہے؟

دانش مند لوگ وُہ ہوتے ہیں جو حصُولِ آزادی کے بعد سب سے زیادہ

توجہ حریتِ فکر کی طرف مبذول کرتے ہیں اور نہایت جرأت مندی سے ایسی تدابیر اختیار کرتے ہیں جو اذہان سے غلامی کے تمام آثار کو جلد سے جلد مٹا دیں - یہ درست ہے کہ عرصۂ دراز سے غلامی کا جو تصور ذہنوں میں جما رہتا ہے وہ چند لمحوں میں زائل نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہوتا ہے مگر اس کے زائل کرنے کی تدابیر میں سے کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن پر فوری طور پر کاربند ہونا سخت ضروری ہوتا ہے ورنہ یہ عرصہ مزید لمبا ہو کر تباہیوں کا باعث بنتا ہے۔

آزادی ملتے ہی فوری طور پر جن تدابیر پہ عمل پیرا ہونا ضروری ہوتا ہے ان میں سے زیادہ اہم یہ تین ہیں :-

۱- سابق آقاؤں میں سے کسی فرد کو کلیدی محکمہ کا سربراہ نہ بنایا جائے۔

۲- ان کے ساتھ کوئی ایسا معاہدہ نہ کیا جائے جو روحِ آزادی کے منافی ہو۔

۳- نظامِ تعلیم اپنے روحانی و مادی تقاضوں کے مطابق تشکیل دیا جائے۔

یہ ایسے تین امور ہیں جن پر عمل درآمد سے بہت جلد ذہنی آزادی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

اِظہارِ رائے کی آزادی

ماضی کی پُوری تاریخ اِس امر پر شاہد ہے کہ تمام افرادِ انسان عقل وخِرد اور
سمجھ بوجھ کے اِعتبار سے کبھی یکساں نہیں رہے بلکہ اِن میں ہمیشہ تفاوت رہا ہے۔
اِسی حقیقت کے پیشِ نظر ہر دَور میں صلاح مشورہ کو بڑی اہمیّت دی جاتی رہی
ہے۔کیا پیغمبر کیا حکمران سب کے سب ضروری امور میں دُوسروں کی آرا معلوم کرنا
لازمی سمجھتے تھے۔ان کے اِس رویّہ کے پس منظر میں یہی اعتراف کار فرما تھا کہ
افرادِ انسانی کا سمجھ بوجھ کے اِعتبار سے یکساں ہونا ضروری نہیں۔نیز ہو سکتا ہے
کہ مطلوبہ مسئلہ سے ایک فرد کو دُوسرے کی بہ نسبت زیادہ لگاؤ ہو یا کسی ایک پر اِس
مسئلہ کا کوئی ایسا پہلو روشن ہو چکا ہو جو دُوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو یا بعض
افراد کے پاس ایسے دلائل ہوں جو دُوسروں کے پاس نہ ہوں۔ لہٰذا ان مختلف افراد
کی آراء حاصل کر لی جاتیں ۔۔(غیر جمہوری حکمران عموماً صرف اِسی پر اِکتفا کرتے
تھے) یا انہیں اپنی آراء کے متعلق مباحثہ کا موقعہ بھی دیا جاتا تاکہ دلائل کی روشنی
میں کسی ایک رائے کی سچائی ظاہر ہو سکے جیسا کہ جمہوری حکومتوں میں ہوتا ہے
مگر جمہوری حکومتوں میں کسی رائے کی منظوری اکثریت کی حمایت پر موقوف ہوتی
ہے جب کہ غیر جمہوری حکومتوں میں فردِ حاکم ہی سب کچھ ہوتا ہے جس رائے

کو وُہ پسند کر لے وہی صحیح شمار ہوتی ہے اور جسے ناپسند کرے وُہ غلط۔

اَب آیئے دَورِ حاضر کی طرف جس میں غیر جمہوری حکومتیں زندگی کے آخری سانس لے رہی ہیں، دُنیا ان سے متنفر ہو چکی ہے۔ صرف جمہوری حکومتیں ہی ایسی ہیں جنہیں بنظرِ استحسان دیکھا جاتا ہے۔ غور کیجیے انہیں کیوں اچھا سمجھا جاتا ہے؟ اِس کی اگرچہ بعض دیگر وجوہ بھی ہیں۔ مگر اظہارِ رائے کی آزادی ایک نہایت ہی اہم وجہ ہے۔ اِن حکومتوں میں ہر شخص کو (اصولی طور پر) اظہارِ رائے کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ وُہ اپنے دل کی بات کھُل کر لوگوں کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ یہ حکومتیں اس کے اِس حق پر پابندیاں لگا کر اُسے گھُٹن کے جہنّم میں نہیں دھکیلتیں۔ اِس کے برعکس غیر جمہوری حکومتوں میں یہ حق صرف چند افراد تک محدُود ہوتا ہے اَور باقی لوگ بھیڑ بکریوں کا ریوڑ خیال کیے جاتے ہیں، اُن کی رائے کے غلط ہونے کا مفروضہ قائم کر کے انہیں اظہارِ رائے کے حق سے محرُوم کر دیا جاتا ہے۔ اَور اگر ان میں سے کوئی جراَت و ہمّت سے کام لے کر اپنے اِس حق کو اِستعمال کرتا ہے تو اُسے بہیمانہ ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

غیر جمہُوری حکمرانوں کی طرح مذہبی رہنما بھی اس حق کو کچلنے میں کسی سے پیچھے نہیں ہوتے بلکہ دو قدم آگے ہی ہوتے ہیں کیونکہ مذہب اَور جذبات کا کچھ چولی دامن کا ساتھ ہو گیا ہے۔ جُونہی کسی شخص نے اپنی ایسی رائے کا اظہار کیا جو کسی مذہبی مسئلہ کے خلاف بیٹھتی ہے تو اس کی مخالفت میں جذبات کا ایک طوفان اُمڈ آتا

ہے۔ اور اِس جوش کے طُوفان میں عقل بے چاری ایک حقیر تنکے کی طرح بہہ جاتی ہے پھر کیا ہوتا ہے؟ اِنسانیت سر پیٹ لیتی ہے، عقل گریبان تار تار کر ڈالتی ہے کیونکہ اِنسانی پیکروں سے درندگی کے دھارے پھُوٹنے لگتے ہیں۔ خنجر چلتے ہیں اور لاشیں تڑپتی ہیں، عورتوں کا سُہاگ لُٹتا ہے اور بچّے یتیم ہوتے ہیں۔ خُون کی اِس ہولی کو دیکھ کر لوگ سہم جاتے ہیں اور کِسی بھی ایسی رائے کے اظہار سے اِحتراز کرتے ہیں جس سے یہ رہنما بھڑک اُٹھتے ہوں کیونکہ وُہ دیکھتے ہیں کہ اکثریّت نے دلائل کی بجائے طاقت کو معیارِ صداقت بنالیا ہے مگر اس سے ان کے دلوں میں اپنے نظریات کے متعلق یقین کمزور نہیں پڑتا بلکہ اور بھی مستحکم ہو جاتا ہے۔ ان کی زبانیں ایک مختصر عرصے کے لئے اگرچہ خاموش ہو جاتی ہیں مگر ولولے بیدار رہتے ہیں۔ ذہن پہلے سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔ یہ گھٹتے نہیں بلکہ زیرِ زمین بڑھتے رہتے ہیں اور اکثریّت کے عقائد پر سخت سے سخت اعتراضات تیار کرتے رہتے ہیں۔ پھر جب وُہ اپنی آواز میں کچھ طاقت محسُوس کرتے ہیں تو بِلا توقّف اپنے اِعتراضات کی بُوچھاڑ کر دیتے ہیں۔ اِدھر اکثریّت جو پہلے صرف طاقت کے بل بوتے پر اپنے عقائد کی ساکھ قائم رکھے ہُوئے تھی اور اِستدلالی میدان میں اُترنے کے لئے تیار نہ تھی۔ اِس ناگہانی حملے سے ذہنی طور پر مغلوب ہو کر اپنے عقائد سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ حالانکہ بہت ممکن تھا کہ مخالفین کے نظریات و دلائل غلط ہوں مگر چونکہ دلائل کو دلائل سے نہیں بلکہ طاقت سے توڑنے کی کوشش

کی گئی اِس لئے غلط نظریات کو پھیلنے کا موقعہ مِل گیا۔

مذہبی رہنماؤں کی کچھ یہ عادت سی بن گئی ہے کہ جُونہی کسی نے کوئی مخالفت کی اس کے خلاف واویلا مچا دیا اور بجائے اِس کے کہ اپنے آپ کو کچھ تکلیف دے کر عقلی دلائل سے مخالف کو مطمئن کرنے کی کوشش کریں محض اپنی سہولت کے لئے عوام کے جذبات بھڑکانے کا آسان ترین نسخہ استعمال کرنے لگتے ہیں جو عموماً فسادات پر منتج ہوتا ہے۔ یہ نسخہ اگرچہ کبھی کبھی زُود اثر بھی نکلتا ہے مگر انجام کار خود نسخہ نویسوں کے حق میں بے حد مُضِر ثابت ہوتا ہے کیونکہ جب عوام کے دلوں میں مذہبی عقائد و نظریات کو دلائل کے ذریعے مستحکم نہیں کیا جاتا تو مستقبل میں جا کر یا تو وُہ مخالفین کے اعتراضات کے سامنے سپر ڈال کر اپنے پہلے عقائد ہی سے دستبردار ہو جاتے ہیں یا اگر پہلے عقائد باقی رہیں بھی تو وُہ ایک زندہ نظریّے کی حیثیّت سے نہیں بلکہ مُردہ تخیّلات کی حیثیّت سے قائم رہتے ہیں جن کا زندگی کی سرگرمیوں سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں کے جذبات ان کے متعلّق بالکل سرد پڑ جاتے ہیں۔ اَور مذہبی پیشوا اِس شکوہ و شکایت میں لگ جاتے ہیں کہ لوگوں کے دِلوں میں مذہبی ولولہ نہیں رہا، مذہب سے لگاؤ نہیں رہا حالانکہ اِس لگاؤ کی جڑیں خود ان رہنماؤں ہی نے کاٹیں جب کہ اُنہوں نے ان عقائد کو ایک زِندہ نظریّے کی بجائے مُردہ تخیّل بنا دیا اَور اب اُن کی حیثیّت صرف یہ رہ گئی کہ ایک مسلمان محض اِس لئے مُسلمان ہے کہ وُہ مُسلمانوں کے گھر

پیدا ہو گیا اور اُس نے تقلیدی طور پر اسلام کا اعتراف کر لیا مگر اس کی صداقت و حقانیت اس کے دِل کی گہرائیوں میں نہ اُتری۔ ایک ہندو صرف اِس لئے ہندو بن گیا کہ اُس نے ہندوؤں کے گھر جنم لیا۔ اور ایک عیسائی محض اِس لئے مسیحیت کا پیرو کار ہو گیا کہ اُس نے عیسائیوں کے گھر آنکھ کھولی۔ ظاہر سی بات ہے کہ دلائل و شواہد کی روشنی کے بغیر محض نسلی طور پر اور اندھی تقلید سے حاصل کیے ہوئے افکار و نظریات کبھی دِل کی گہرائیوں میں نہیں اُتر سکتے اور جب تک کوئی نظریہ دل میں گھر نہ کر لے۔ اس کا زندگی کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں پیدا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کی عمارت کا ایسے عقائد سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہوتا پھر ستم بالائے ستم یہ کہ ایسے نظریات ایک ڈراؤنے دیو بنے دل کے دروازوں پر کھڑے رہتے ہیں، نہ تو خود اندر جا سکتے ہیں اور نہ کسی دُوسرے ایسے نظریے کو آسانی سے اندر جانے دیتے ہیں جس کا زندگی کی سرگرمیوں سے کچھ تعلق ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسے عقائد کے حامل لوگ اِنتہائی پستیوں میں جا گرتے ہیں۔

آزادیٔ اظہارِ رائے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے حق و باطل ممتاز ہوتے رہتے ہیں جس سے لوگ تاریکیوں سے نکل کر عالمِ انوار میں آ جاتے اور شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو جاتے ہیں۔ جن ملکوں اور ادوار میں یہ حق وسیع پیمانے پر دیا جاتا ہے اُن میں عظیم الشّان مفکّر پیدا ہوتے ہیں، بڑے بڑے فلسفی اذہان جنم لیتے ہیں جن کے رشحاتِ فکر انسانیت کے حق میں آبِ حیات ثابت ہوتے

ہیں۔ میں اسی لئے اِس حق پر زیادہ زور دیتا ہوں کہ کسی رائے کو دبانے میں صرف ایک صاحبِ رائے ہی کا نقصان نہیں ہوتا بلکہ تمام اِنسانوں کا نقصان ہوتا ہے پھر اسی دَور کے اِنسانوں کا نہیں بلکہ مستقبل میں آنے والوں کا بھی۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وُہ دبی ہوئی رائے روشنی کا ایک مینار ہوتی جس سے جہالتوں اَور توہّم پرستیوں کے کِتنے ہی اندھیرے دُور ہو جاتے۔ اِس رائے کو دبانے میں خود دبانے والوں کا بھی عظیم نقصان ہوتا ہے کیونکہ اگر یہ رائے واقعہ میں صحیح تھی تو وُہ ایک صحیح رائے سے محروم ہوکر غلط نظریّے پر جمے رہے اَور اگر یہ غلط تھی تو بھی وُہ نقصان میں رہے کیونکہ اس کے اظہار کی صورت میں حق و باطل کے تقابل سے حق کو جو تقویّت پہنچنا تھی وُہ اس سے محروم رہے۔

آخر اِنسانوں کے اِس بنیادی حق کو پامال کرنے والے اپنی اِس ناشائستہ حرکت میں کِس چیز کا سہارا لیتے ہیں؟ اگر وُہ کہیں کہ چونکہ ہمیں مخالف رائے کے غلط ہونے کا یقین ہے اِس لیئے ہم اِس کے اظہار پر پابندی لگاتے ہیں تو اِن حضرات کو اِس پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ دُوسرے فریق کو بھی اپنی رائے کی صداقت اور ان کے نظریّے کے غلط ہونے کا انہی جیسا بلکہ بسا اوقات ان سے بھی بڑھ کر یقین ہوتا ہے۔ اِسی طرح پابندی لگانے والوں کا اکثریت میں ہونا بھی اِس پابندی کے لئے کوئی وجہِ جواز نہیں بن سکتا کیونکہ ۹۰ فی صد افراد اگر اپنے دل کی باتیں بے دھڑک لوگوں کے سامنے ظاہر کر سکتے ہیں۔ تو ۱۰ فی صد پر کیوں پابندی لگائی جاتی ہے؟

کیا ۹۰ فی صد تعداد والوں کا اکثریت میں ہونا اُن کے افکار کی صحت اور ۱۰ فی صد والوں کا اقلیت میں ہونا ان کی رائے کے غلط ہونے کا معیار ہے۔ اگر یہی بات ہے تو پھر ایک ملک کی یہ اکثریت جب کسی دُوسرے ملک میں اقلیت میں ہوتی ہے تو کیا مخالفوں کی کثرت کے پیشِ نظر اس کے عقائد کو غلط کہا جائے گا؟ کیا یہ دُرست ہے کہ کسی قوم کے مخصُوص عقائد جہاں وُہ اکثریت میں ہو صحیح ہوتے ہیں اور جہاں وُہ اقلیت میں ہو وُہی عقائد سراسر غلط ہو جاتے ہیں؟ اس سے بڑھ کر اور کون سا غلط تخیّل ہو سکتا ہے۔ صداقت کا معیار، افراد کی کثرت و قلت ہرگز نہیں ہوتی بلکہ وُہ دلائل و براہین ہوتے ہیں جو کسی رائے کی واقعیّت کو ثابت کرتے ہیں۔ اگر کسی رائے کو دبا ہی دیا گیا تو نہ اس کے دلائل پیش کرنے کا موقعہ آئے گا نہ صداقت واضح ہو گی۔

اکثریت والوں کو اپنی اکثریت سے دھوکہ میں نہیں پڑنا چاہیئے بلکہ تاریخِ اقوام پر نظر ڈال کر درسِ عبرت لینا چاہیئے۔ تاریخ دراصل اِسی لئے مرتّب کی جاتی ہے کہ اِس سے سبق حاصل کیا جائے، صحیح و غلط نظریات کی جانچ پرکھ کی جائے۔ تاریخ چُومنے چاٹنے یا اسلاف کے قِصّے سُنا سُنا کر "پدرم سُلطان بُود" کے نعرے لگانے کے لئے نہیں ہوتی۔ اگر ماضی میں ایک نظریہ کے حامی پھیلے اور دُنیا پر قابض ہُوئے تو ضروری نہیں کہ اُن کے عقائد درست ہی ہوں۔ اگر طاقت کِسی انتہائی درجہ کے غلط عقیدہ کی پُشت پناہی کرے تو اُسے بھی

بڑی ترقی حاصل ہوجاتی ہے اور اس نظریّے کے حامی اگر دُنیا کو فتح کر لیتے ہیں تو اس کا سبب ان کے نظریّے کی صداقت نہیں ہوتا بلکہ وُہ مخصُوص تاریخی و اتفاقی حالات ہوتے ہیں جو انہیں طاقت اِقتدار بخشتے ہیں اور اِس اقتدار کے بل پر وُہ فاتحِ عالم قرار پاتے ہیں۔

اکثریّت سے تعلّق رکھنے والے کسی فرد سے جب یہ کہا جائے کہ تمہارا نظریّہ درست نہیں تو وُہ اپنے نظریّے کی صداقت کے متعلّق اپنی اکثریّت پر اعتماد کرتے ہُوئے نہایت جوش سے کہتا ہے کہ واہ صاحب جس نظریہ کی قائل اِتنی دُنیا ہے وُہ تو غلط ہو اور آپ چند آدمیوں کی رائے صحیح ہو: معاف کیجیے گا ہم اِس "دنیا" کے ساتھ چلیں گے آپ ڈھائی آدمیوں کے ساتھ چلتے رہے۔ حالانکہ یہ بھلے مانس اس پر غور نہیں کرتا کہ جس "دنیا" پہ وُہ اِس قدر اعتماد کا اِظہار کر رہا ہے اس سے اس کا تعلّق محض اِتفاقی حادثہ ہے۔ جن اسباب کی بنا پر وُہ رُوم میں مسیحیّت اور بنارس میں ہندو مت کا پرستار بن سکتا ہے انہی کی بِنا پر ٹوکیو میں بدھسٹ اور مکّہ میں مسلمان ہو سکتا ہے۔ پس محض یہ اِتفاقی اسباب کِسی رائے کی صداقت کی دلیل نہیں ہوتے اگرچہ ان کی بنا پر ایک دنیا کِسی نظریّہ سے کیوں نہ منسلک ہو جائے۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ زمانے میں بہت سے ایسے نظریات بھی رہے جنہیں اِس دور کی اکثریّت نے تسلیم کیا مگر بعد کے زمانے میں وہی نظریات سراسر لغو اور مہمل قرار پائے۔ دورِ سقراط کے یُونان کی یہی کیفیت تھی۔ دیوتا پرست قریباً

۰۰ فی صد کی اکثریت میں تھے۔ صرف ایک شخص سُقراط نے ان کے نظریے کے خلاف برملا اپنی رائے کا اظہار کیا مگر اکثریت نے اِس مفروضہ پر کہ ہم اکثریت میں ہیں لہٰذا ہمارا نظریہ صحیح ہے اَور سُقراط تنہا ہے لہٰذا اس کا نظریہ غلط ہے۔ اس عظیم مفکّر کو زہر کا پیالہ پلا کر موت کی نیند سُلا دیا۔ گو آج دَورِ حاضر کی سب اکثریتیں عہدِ ماضی کی اِس یُونانی اکثریت کی عقل کا ماتم کر رہی ہیں لیکن اُنہیں اپنے گریبان میں بھی مُنہ ڈال کر جھانک لینا چاہیئے، کہیں وُہ خود بھی کِسی اقلیّت کے ساتھ ایسا ہی سلوک تو نہیں کر رہے۔ انہیں اِس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیئے کہ موجُودہ دَور میں بھی کِتنے ہی اَیسے نظریات رائج ہوں گے جو مستقبل میں سراسر لغو اَور نامعقول قرار پائیں گے جس طرح کہ ماضی کی بہت سی آرار آج کے زمانے میں مردُود و نامعقول قرار دی جا چکی ہیں۔ پس اِنسانوں کو تاریکی سے نکالنے کے لئے بے حد ضروری ہے کہ اظہارِ رائے کی آزادی دی جائے تاکہ غلط آرار سے نجات مِلے۔ صحیح آرار کی پیرَوی ہو، زمانہ سازی و منافقت کا خاتمہ ہو اَور ذہنی ترقی کی وُہ سطح پیدا ہو جس نے بعض اَدوار کو دائمی شہرت بخشی ہے۔

دُنیا میں ظلم وستم کے دَور دورے اَور عدل و انصاف کے فقدان میں اظہارِ رائے پر پابندی کو بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ ظالم طبقہ مظلوموں کو تو بولنے نہیں دیتا اَور اپنے ظلم وستِم کو نہایت مُلمّع کیئے ہُوئے الفاظ میں عین عدل و اِنصاف بنا کر پیش کرتا ہے۔ کِسی طرف سے مخالف آواز نہ اُٹھنے کے سبب عوام کی ایک بڑی

تعداد بھی اِس ظلم کو اِنصاف ہی خیال کرنے لگ جاتی ہے اور انسانیت اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہو کر ظلم کی چٹانوں تلے کراہنے لگتی ہے۔ پس یہ لازم ہے کہ انسانوں کو ان کا یہ پیدائشی حق دے کر ظلم و ستم کا خاتمہ اور عدل و اِنصاف کا دور دورہ کیا جائے۔ نیز کِسی کے آزادیٔ اظہارِ رائے کا حق محض اُن امور تک محدود نہیں کرنا چاہیئے جن کا تعلق تنہا اس کی ذات سے ہے بلکہ جن امور کا تعلق دُوسروں سے ہے ان کے متعلق بھی آزادیٔ اظہارِ رائے اس کا پیدائشی حق ہے کیونکہ تمام بنی نوعِ انسان ایک ہی جسمِ اِنسانیت کے مختلف اعضا ہیں اِس لیئے ہر فرد کو اپنے اور دُوسروں کے اُمور کے متعلق یکساں طور پر رائے ظاہر کرنے کا حق حاصِل ہے کیونکہ کوئی دُوسرا اِنسان غیر نہیں بلکہ اپنے ہی جسمِ اِنسانیت کا ایک حِصّہ ہے۔

نامور شخصیّتوں کا مُطالعہ

تارِیخ اِنسانی ایک مسلسل عمل کا نام ہے جس میں واقعات کی بے شمار کڑیاں محض اِتفاق سے نہیں بلکہ فِطرت کے قوانین کے تحت آپس میں جڑی ہوتی ہیں۔ ہر پچھلا واقعہ پہلے واقعہ سے کِسی نہ کِسی طور پر مربُوط ہوتا ہے۔ کوئی تارِیخی واقِعہ اچانک ظاہر نہیں ہوجاتا بلکہ اس کا سر چشمہ ان جُڑی ہوئی کڑیوں میں کہیں نہ کہیں لازمی طور پر موجُود ہوتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ تاریخ کے اِس مسلسل عمل میں ہر پہلا واقعہ پچھلے واقعہ کے سبب پر مشتمل ہوتا ہے۔

گذشتہ دور کے واقعات اَور ان کے اسباب پر غور کرنے سے ہم اپنے دَور کے واقعات پر مستقبل میں مرتّب ہونے والے اثرات کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ تاریخ کا یہ عظیم فائدہ ہے کہ ماضی کے واقعات کے اسباب وعِلل اَور اثرات پر آگاہ ہوکر ہم خطرات سے محفوظ ہو سکتے اَور اپنے حال و مستقبل کو تابناک و درخشاں بنا سکتے ہیں۔

ماضی کے مختلف اَدوار میں کچھ ایسی نامور شخصیّتیں گذری ہیں جن کے کردار و افکار نے تاریخ کے صفحات پر اَنمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اِن حضرات نے اپنی فکرِ رسا، اِحساسِ بیدار اَور بے پناہ صلاحیّت سے وقت کے تقاضوں

کو سمجھا اور انسانیّت کو صحیح پٹڑی سے اُتارنے والے عقائد و رسوم کے خلاف سینہ سپر ہو کر، لوگوں کے غلط میلانات و رُجحانات کو ختم کیا اور ان کے دلوں کا رُخ انسانیت افروز عقائد و رسوم کی طرف موڑ دیا۔ یہ شخصیّتیں بلاشبہ انسانیت کی مُحسن ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے وقت میں بڑے عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ اُن کے کردار کی عظمت جاننے کے لیئے اُس دَور کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے جس میں اُنہوں نے اعلانِ حق کیا۔ انسانیّت کو بلندیوں تک لے جانے میں ان محترم حضرات کا بڑا حِصّہ ہے۔ آج کے ترقی یافتہ دَور کو معیار بنا کر ان کے کردار کی عظمت کو پرکھنے کی کوشش ان حضرات پر ایک کھُلا ظلم ہے۔

مجھے اُن نقّادوں پر بڑا افسوس ہوتا ہے جو موجودہ دَور کے افکار کو معیار بنا کر ماضی کے اِن عظیم محسنوں پر اوچھے وار کرتے ہیں۔ کیا یہ نقّاد اِس بات کو پسند کریں گے کہ مستقبل کے نقّاد، اپنے دَور کے افکار کو معیار بنا کر موجودہ دَور کے اِن نقّادوں کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔

حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ ماضی کی محترم شخصیّتوں کے افکار و کردار کا مُطالعہ کیا جائے۔ ان کی جو بات خلافِ واقعہ ہو یا جو نظریہ موجودہ دَور میں ناقابلِ عمل ہو چکا ہو اُسے چھوڑ دیا جائے اور صحیح باتوں سے اِستفادہ کیا جائے۔ ماضی کے سچے رہنما بھی اِنسانیّت کے حق میں اتنے ہی مخلص تھے جتنا کہ حال کا کوئی مُصلح ہو سکتا ہے۔

اِن ہستیوں کا وجود کسی دَور کے تقاضوں اَور اس دَور کی انسانیت دوست تحریکوں کا ایک ایسا نشان ہوتا ہے جس کے مُطالعہ سے اِن تقاضوں اَور تحریکوں تک آسانی سے رسائی حاصِل کی جا سکتی ہے۔

اِن حضرات نے اِنسانیّت کے اِرتقاء میں سرگرمی سے حِصّہ لیا۔ عوام کے شعور کو بیدار کر کے اِن میں وقت کے تقاضوں کا اِحساس پیدا کیا۔ اس طرح اِنقلابیوں کی ایک ایسی جماعت تیار کر لی جس نے اِنسانیّت کُش معاشرے کو ختم کر کے اس کے کھنڈرات پر ایک اِنسانیّت افروز معاشرے کی عمارت کھڑی کر دی۔

نامور شخصیّتوں کا مُطالعہ یُوں تو ہر دَور میں مفید ہوتا ہے مگر تاریک اَدوار میں تو اس کی افادیّت بہت ہی بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ ہستیاں اپنے اپنے دَور کے تقاضوں اَور اِنقلابی تحریکوں کا نشان و مظہر ہوتی ہیں اَور دُوسرے افراد کے لیئے ایک عُمدہ نمونہ۔ اِس نمونہ کو سامنے رکھ کر اِنسانیت دوست اِنقلابی بہت جلد اِنسانیّت افروز اِنقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

عدل و مساوات کا مطالبہ کیوں؟

ہر مفکر اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ آخر کار دُنیا کو مجبور ہو کر عدل و انصاف اور مساواتِ انسانی کے اصولوں کو اپنانا ہوگا۔ جب یہ یقین ہے کہ ایسا ہی ہوجانا ہے تو پھر اپنے اپنے دَور میں اس کے حصُول کے لئے جد وجہد کیوں کی جاتی ہے اور قید و بند اور دار و رسن تک کی صعُوبتوں کو کیوں سر پر لیا جاتا ہے؟

جب سے نظامِ سرمایہ داری نے جڑیں پھیلائی ہیں اس وقت سے عدل، انصاف، صداقت اور ہمدردی وغیرہ کے معنی سراسر بدل گئے ہیں۔ ان کا دائرہ اب پہلے کی طرح وسیع نہیں رہا بلکہ بے حد سُکڑ چکا ہے۔ اب اُن کا محور صرف اُونچے طبقے کا مفاد رہ گیا ہے۔ غریب کے مفاد سے اُنہیں تقریباً کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس وقت عدل وہی ہے جسے سرمایہ دار عدل کہے، صداقت وہی ہے جسے سرمایہ دار صداقت کہے۔ کیونکہ "کہنے" کے ذرائع پر سرمایہ دار کا قبضہ ہے۔ غریب کی زبان کا مالک وُہ ہے، دل و دماغ پر قابض وُہ ہے اور ارادوں پر مُسلّط وُہ ہے۔ اس کی پیشانی کی ایک ادنیٰ شکن سینکڑوں بے گناہ غریبوں، مزدُوروں اور کسانوں کو ہمیشہ کی نیند سُلا سکتی ہے۔ توپ و تفنگ پر اس کا قبضہ ہے، گولیوں پر اس کا تصرّف ہے۔ غریب کے پاس کیا ہے؟ ہڈیوں کے پنجر جن پر سے تمام گوشت

نوچ لیا گیا ہے مگر سرمایہ دار ان ڈھانچوں کو بھی نہیں دیکھ سکتا اِس لئے گولیوں سے ان بے گوشت ہڈیوں کو بھی چُور چُور کر دینا چاہتا ہے۔

سرمایہ دار اپنے شکنجے مضبُوط کرنے کے لئے تین حربے خصُوصی طور پر اِستعمال کرتا ہے۔

۱۔ مذہبی رہنماؤں سے مِلی بھگت

اِس ڈھنگ میں سرمایہ دار کافی حد تک کامیاب ہوا ہے۔ وُہ مذہبی رہنماؤں کو سیم و زر کی جھنکار سے خیرہ کر کے اپنا ہم نوا بنا لیتا ہے اَور اَن پڑھ عوام جن کے دِل و دماغ پر مذہبی سربراہوں کی زبردست حکومت ہوتی ہے نہایت سادگی سے "راضی برضائے الٰہی" اَور "مطمئن بہ تقدیرِ خُداوندی" ہو کر اپنے آپ کو سرمایہ دار کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں اَور اپنے حقوق کے متعلق زبان پر کوئی لفظ لانے سے اِس لئے گریز کرتے ہیں کہ ان کی آخرت خراب نہ ہو۔ کیونکہ مالدار مذہبی رہنما دنیا کی حکومت تو سرمایہ دار کی قسمت میں اَور آخرت کی بادشاہی غریب کے نصیب میں بتاتے ہیں۔ غریب یہ سوچ کر کہ دُنیا میں تو میری بادشاہی ہے نہیں اپنی آخرت کی بادشاہی سے کیوں ہاتھ دھوؤں، مالدار مذہبی رہنماؤں اَور استحصالی سرمایہ داروں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے ان کی دولت بڑھانے کا ایک مشینی پُرزہ بن جاتا ہے۔ اب حال یہ ہوتا ہے کہ اُس کی اوسط عمر جس قدر گھٹتی ہے سرمایہ دار کی اوسط عُمر اتنی ہی بڑھتی اور اس کے سرمایہ میں اُسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔ اُدھر

سرمایہ دار مذہبی رہنماؤں کو بھی اپنا محتاج بنائے رکھتا ہے اور اُن کے ذرائع آمدن پر پُوری طرح تسلّط جمائے رکھتا ہے تاکہ وُہ اس کے اشاروں پر ناچنے سے انکار نہ کر سکیں۔ جُونہی کوئی مذہبی رہبر اس کا آلۂ کار بننے سے پہلوتہی پر آمادہ ہوا اس کی آمدن کے تار کاٹ دیئے گئے اور اُسے بے حد زبُوں حال بنا دیا گیا تاکہ اس کی خستہ حالی سے دُوسروں کو بھی عبرت حاصل ہو اور وُہ کبھی بھی سرمایہ دار کی حکم عدولی کا تصوّر تک دل میں نہ لا سکیں بلکہ ہمیشہ کے لئے اس کے ہاتھ میں غریبوں کے اِستحصال کے آلے اور اس کے کارخانے کے مزدُوروں کے مذہبی محاسب بنے رہیں۔

۲۔ غریبوں کی معاشی بدحالی

سرمایہ دار اپنے تسلّط کو مضبُوط رکھنے کے لئے ایک خاص فلسفے کا پابند ہے وُہ یہ کہ مزدُوروں کو صرف اتنی مزدُوری دی جائے جس سے صرف ان کی رُوح اور بدن کا رِشتہ قائم رہ سکے اور وُہ بھی محض اِس لئے کہ وُہ اپنے "سینکڑوں خداؤں" کی دولت میں اضافہ کر سکیں۔ انہیں اِتنی مزدُوری ہرگز نہیں دینی چاہیئے جس سے وُہ اپنے اِن "خداؤں" کے پنجوں سے رہائی پا سکیں۔ پھر بسا اوقات یہ کوشش بھی کی جاتی ہے کہ مزدُور، کارخانہ داروں کے بنائے ہوئے کوارٹروں ہی میں (کرایہ پر یا عاریۃً) رہیں تاکہ اُن کی مجبُوریوں اور اپنی دھمکیوں سے پُورا فائدہ اُٹھایا جا سکے اور اگر وُہ کہیں اور بھی رہنا چاہیں تو آقاؤں کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ وُہ ایک

کرایہ داری کی حیثیت سے رہ سکیں تاکہ کرایہ مکان اور روٹی کی فکر انہیں کارخانہ داروں کے مظالم سہنے کے باوجود کارخانہ سے علیحدگی پر آمادہ نہ ہونے دے۔ اور اگر یہ غریب کبھی بجائے کرایہ کے مکانوں میں رہنے کے کہیں اپنے جھونپڑے بنا لیتے ہیں تو سرمایہ داروں کو یہ اندیشہ ہو جاتا ہے کہ ڈیڑھ روپیہ یومیہ مزدوری سے شاید یہ کچھ بچا لیتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ہمارے پنجے سے نکل جائیں۔ اس خیال سے ان کے جھونپڑوں کو آگ لگا دی جاتی ہے اور پھر مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے جب تحقیقات ہوتی ہے تو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ شاید کسی نے سلگتی ہوئی سگرٹ کسی جھونپڑے میں پھینک دی تھی جس سے اُسے آگ لگ گئی پھر آگ نے تمام جھونپڑوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مگر یہ چالاک اور عقل مند سگرٹ عموماً اُسی وقت جھونپڑے جلاتی ہے جس وقت مزدور کام پر چلے گئے ہوتے ہیں اور ان کے بیوی بچّوں میں سے صرف مزدوری نہ کر سکنے والے افراد ہی گھر پر موجود ہوتے ہیں۔ پھر یہ سگرٹ کیسی تاڑنے والی آنکھ رکھتی ہے کہ جس طبقہ کے ننانوے فی صد افراد اسے صبح شام بے تحاشا پھونکتے ہیں ان کی تو ایک رضائی تک نہیں جلاتی مگر وہ طبقہ جس کے چند فی صد افراد اسے پیتے ہیں ان کے گھر بار اور تمام پونجی کو راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کارخانہ داروں کی تیار کردہ سگرٹیں بڑی ہی وفادار ہوتی ہیں۔

۳۔ گولی | جب غریب کے دل و دماغ پر سے سرمایہ دار کی ساحری کے اثرات

زائل ہونے لگتے ہیں اور وُہ بیدار ہو کر اپنی اہمیّت اور اپنے حقوقِ انسانیت پر نظر ڈالتا ہے تو چلاّ اُٹھتا ہے۔ مجھے اِنسان نہیں سمجھا جاتا، مجھے مشین کا ایک پُرزہ سمجھا جاتا ہے۔ میری محنت سے جو منافع پیدا ہوتا ہے اس سے مجھے تو برائے نام ہی ملتا ہے سارے کا سارا تو ٹانگ پر ٹانگ رکھے ہُوئے سرمایہ دار ہڑپ کر جاتا ہے، وُہ ہمیشہ مجھے عاجز و نزار رکھتا ہے، وُہ میری رگوں سے خُون چُوس کر اپنا تن و توش موٹا کرتا ہے، وُہ میرے جھونپڑوں کو جلا کر اپنی کوٹھیاں تعمیر کرتا ہے، وُہ میری زندگی کو گھٹا کر اپنی زندگی بڑھاتا ہے۔ اب میں نے اپنے حقوق حاصل کِیے بغیر اس کے کارخانے میں کام نہیں کرنا، میں نے اپنا حق وصول کیے بغیر زمیندار کے کھیت میں ہل نہیں چلانا۔ جب غریب بیدار ہو کر اپنے آقاؤں کے سامنے اپنے مطالبات پیش کرتا ہے، ہڑتالیں اور مظاہرے کرتا ہے تو اس کے جواب میں اُسے کیا مِلتا ہے؟ آقا، پولیس طلب کر لیتا ہے۔ کسی بہانے کی آڑ لے کر بندوقوں کی لبلبیاں دبا دی جاتی ہیں۔ فضا میں دھماکوں کی آواز گونجتی ہے، کِتنے ہی بے گُناہ غریبوں کے سینے چھلنی کر دیئے جاتے ہیں۔ بچّوں کے سر سے سایہ چھین کر اُنہیں یتیم بنا دیا جاتا ہے، عورتوں کا سُہاگ لُوٹ کر اُنہیں بیوہ کر دیا جاتا ہے غریب کے اِس رنگین خون سے سرمایہ دار کی رنگین عمارتیں تعمیر ہوتی ہیں۔ مگر یہ گمنام شہید جان کی بازی لگا کر سرمایہ داری کے شکنجے ڈِھیلے کر دیتے ہیں اور دُوسرے غریبوں کو اُن کے کچھ حقوق مِلنے لگتے ہیں۔

ظُلم کے خلاف مظلُومیّت کی یہ جنگ اٹھارھویں صدی سے منظّم طور پر جاری ہے اور اب تک ہزاروں غریب، مزدُور و کِسان اپنی زندگیاں، سرمایہ داری کی نجس دیوی کی بھینٹ چڑھا چکے ہیں۔ سرمایہ دار تاریخ پر نظر ڈالیں اور بتائیں کیا اب بھی اُن کے شکنجے پہلے ہی کی طرح مضبُوط ہیں یا ڈِھیلے پڑ چکے ہیں؟ اِس سے وُہ خود اندازہ کر سکیں گے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خاتمے کے دِن قریب ہیں۔ جب ماضی قریب کی تاریخ اِس اِنسانیت کُش نظام کی ناکامی کے واقعات سے بھرپُور ہے تو دولت کے پُجاری اور غریبوں کے اِستحصال کے حریص عقل کے ناخن کیوں نہیں لیتے؟ وُہ کیوں لاکھوں کروڑوں اِنسانی جانوں کے بَیری بنے ہُوئے ہیں۔ انہیں معلُوم ہو جانا چاہیئے کہ غریب اِنسان بہت بیدار ہو چکا ہے، اب اس کا اِستحصال زیادہ عرصے تک نہیں ہو سکے گا۔ عدل و انصاف کا دَور قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اب ظلم و سِتم کی بُنیادوں پر استوار کیا ہُوا نظام زیادہ دیر تک نہیں چل سکے گا۔

جب ایسا ہونا ہی ہے تو پھر خُلّت کا پرچار کرنے والوں کو اِس نظام کے خلاف جدوجہد کر کے خواہ مخواہ اپنے اَوقات تلخ بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہی وُہ سوال ہے جسے ہم نے شروع میں ذکر کیا تھا۔ ہمارے بیان مذکور کی روشنی میں اِس کا جواب سامنے آجاتا ہے کہ عادلانہ مُنصِفانہ اَور مساویانہ نظام کے نفاذ میں جس قدر تاخیر ہو گی اُسی قدر زیادہ تعداد میں اِنسانی جانیں ناحق تلف

ہوں گی۔ جس مساویانہ نظام نے بہرحال نافذ ہو کر رہنا ہے ہم اس کے متعلق دولت پرستوں کے گوش گذار کرنا چاہتے ہیں کہ وُہ ابھی سے اُسے پُرامن طریق پر قبول کر لیں تاکہ جہاں لاکھوں بے گناہ غریب ظلم وستم کی چکی تلے پسنے سے بچ جائیں وہاں وُہ خود بھی غریبوں کے انتقام سے محفوظ رہیں۔ اگر امن وشرافت سے منصفانہ نظام نہ قائم کیا گیا تو پھر تاریخ اپنا فیصلہ صادر کر دے گی جسے ٹالنا کسی کے بس کی بات نہ ہو گا۔

فرد اور معاشرہ

ہر فرد، جماعت کا ایک جُز اور حِصّہ ہوتا ہے۔ اِنہی افراد کے مجمُوعے کا نام جماعت ہوتا ہے۔ اِن سے الگ ہو کر جماعت کا کوئی وجُود نہیں۔ لہٰذا فرد کی اچھائی بُرائی کا اثر جماعت (معاشرے) پر پڑے گا اور جماعت کی اچھائی بُرائی کا اثر فرد پر۔ اِسے مثال کے ذریعے یُوں سمجھئے کہ ایک چھت ہے جو کہ بیس ستونوں پر قائم ہے اگر اِس کے تمام کے تمام ستوُن درست ہُوئے تو اس کی دِلکشی اور استواری پُورے طور پر قائم رہے گی۔ اگر ان ستونوں میں سے ایک بھی ناقص ہو گیا تو اس سے پُوری چھت عیب دار ہو جائے گی۔ باقی ماندہ ستون اس کی پہلے والی دلکشی اور استواری برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ یا ایک ایسی گاڑی فرض کیجیے جو دس پہیوں پر چل رہی ہے اس کے کسی ایک بھی پہیے کی خرابی اس کی رفتار میں کمی پیدا کر دے گی حالانکہ باقی پہیے بالکل درست ہیں مگر ان کے ایک ساتھی کا نقص تمام پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔

اگر انسانی معاشرے کو ایک کُل فرض کیا جائے تو ہر فرد اس کا ایک جُز ہے اگر چھت فرض کیا جائے تو ہر فرد اس کا ایک ستون ہے، اگر گاڑی فرض کیا جائے تو ہر فرد اس کا ایک پہیہ ہے۔ آپ نے ان مثالوں میں دیکھا کہ کِس طرح ایک فرد

کی خرابی دُوسروں پر اثر انداز ہوتی اور ان کی رفتارِ ترقی میں رکاوٹ ڈال دیتی ہے بالکل یہی حال اِنسانی معاشرے کی گاڑی کا بھی ہے اگر اس کا ایک پہیہ بھی فاسد ہو جائے تو اس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے کیونکہ اس سے اِنسانی گاڑی کی رفتار میں کمی پیدا ہو جاتی ہے جس سے اُسے منزلِ مقصُود تک پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ یہ تاخیر صرف اسی ایک پہیئے تک محدُود نہیں ہوتی بلکہ سب افراد پر حاوی ہوتی ہے۔

جب فرد اَور معاشرے کے باہمی تعلّق کی کیفیّت یہ ہے تو اب معاشرے کی ترقی کا خواب اُسی وقت پُورا ہو سکتا ہے جبکہ افراد کی اِصلاح کی جائے اَور ان کے اِضطراب کو دُور کیا جائے۔ اِس کے لئے اُن اسباب کو معلوم کرنا ضروری ہے جنہوں نے فساد اَور بے چینی کو معاشرے کا تقریباً لازمی حِصّہ بنا ڈالا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر مختصر طور پر دو اسباب بیان کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے فساد و بے چینی کو جنم دیا ہے۔ ایک ہے رُوحانیّت سے بے گانگی اَور دوسرا ہے اِنفرادیّت پرستی۔ آج کل کیفیّت یہ ہے کہ رُوحانیت کے نام سے لوگ چڑ کھاتے ہیں اَور تمام اخلاقی قدروں سچّائی، عدل و اِنصاف، ادب و اِحترام، شفقت و محبّت، خوش خُلقی، ہمدردی، حیا وغیرہ سے — جو کہ تہذیب و شرافت کی بُنیاد ہیں — لاپرواہی برتی جاتی ہے بلکہ ایک طبقہ کھلّم کھلّا ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اُدھر اِنفرادیّت پرستی کی یہ کیفیّت ہے کہ لوگوں نے اپنے فکر و عمل کو صرف اپنے ذاتی مفاد تک محدُود

کر دیا ہے اور اِس کے لئے ہر جائز و ناجائز طریقہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ گئی ہے۔ غریب و امیر میں بہت بڑی خلیج حائل ہو گئی ہے۔ ظالم طبقہ لوٹ رہا ہے اور مظلوم و بے بس طبقہ لُٹ رہا ہے۔ کرسی والے اپنے فرائض اور عوام کے حقوق سے بے خبر کرسی میں مگن ہیں۔ ایسے حالات میں معاشرہ تباہ نہیں ہو گا تو کیا ہو گا۔

معاشرہ صرف اِسی طرح تباہی سے بچ سکتا ہے کہ لوگ رُوحانی و اخلاقی اقدار کو اختیار کریں۔ تمام افراد میں مساوات ہو، دولت کی عادلانہ و مُنصفانہ تقسیم ہو، ہر شخص اپنے فرائض دیانت داری سے سرانجام دے، کوئی کسی پر ظلم نہ کرے، کوئی کسی کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کرے، کوئی کسی حقدار کا حق غصب نہ کرے۔ یہی خُلّت کی آواز ہے جس پر لبّیک کہنے سے اِنسانی معاشرہ تباہی سے بچ کر امن و ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

ایک انسان دُوسرے کی مدد کیوں کرے؟

تمام اِنسان آپس میں وُہی نسبت رکھتے ہیں جو ایک جسم کے اعضاء ایک دُوسرے سے رکھتے ہیں۔ ان اعضاء کی یہ کیفیّت ہے کہ جب کوئی شخص سارا دن مزدوری کر کے پیسے کما کر لاتا ہے تو ایسا کبھی نہیں ہُوا کہ چونکہ ہاتھوں نے سارا دن ہتھوڑے مار مار کر پتھر توڑے یا زبان سارا دن تدریس کیلئے استعمال ہوتی رہی۔ لہٰذا اب یہ اُجرت صرف ہاتھوں یا زبان ہی پر خرچ کی جائے۔ پاؤں کو، سَر کو اور دُوسرے اعضاء کو اس سے محروم رکھا جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ کبھی کسی نے ایسا نہیں کیا کیونکہ ہر شخص جانتا ہے کہ میرے تمام اعضاء ایک اکائی میں پروئے ہوئے ہیں ان میں ایک کو بھی نقصان پہنچا تو اِس سے پُورا جسم متاثر ہوگا اور دوسرے اعضاء کی صلاحیّتِ کار بھی گھٹ جائے گی۔ اِس لئے کمائے خواہ جسم کا کوئی حِصّہ اس کمائی سے فائدہ اُٹھانے کا حق پُورے جسم کو ہے کیونکہ ہر عضو کی صلاحیّتِ کار، تحفظ اور ترقّی پُورے جسم کی صِحت و سلامتی سے وابستہ ہے۔ دُوسرے لفظوں میں یُوں کہا جا سکتا ہے کہ ہر عضو صرف اِس لئے کمانے کے لائق ہُوا کہ وُہ جسم کا ایک حِصّہ ہے اِس لئے اس کا فرض ہے کہ اپنا کمایا ہُوا صرف اپنے پر خرچ نہ کرے بلکہ پُورے جسم کا خیال رکھے اور دُوسرے اعضاء کی ضروریات بھی پُوری کرے۔

اِسی طرح نوعِ انسان کے افراد بھی جسمِ انسانیت یعنی اِنسانی معاشرے کے مختلف اعضاء ہیں۔ ان پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اپنے پُورے جسم (اِنسانی معاشرے) کی صحت وسلامتی کا خیال رکھیں اَور یہ نہ بھُولیں کہ ان کا مہذّب و متمدّن اَور ترقی یافتہ ہونا سب اِسی جسمِ اِنسانیت کا صدقہ ہے۔

ہر معاشرہ، اِنسانی ارتقار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اقدار کا مظہر ہوتا ہے، اپنے افراد پر اس کا یہ عظیم اِحسان ہوتا ہے کہ وُہ اِن اقدار کو ان افراد کی طرف منتقل کر کے انہیں ترقی یافتہ اِنسان بنا دیتا ہے کیونکہ کسی بھی اِنسانی معاشرے میں جب کوئی فرد آنکھ کھولتا ہے تو پیدا ہوتے وقت وُہ ایک بے خبر جانور سا ہوتا ہے اگر اُسے اِنسانی ماحول کی بجائے جنگل میں پہنچا دیا جائے اَور وُہ وہیں پلے بڑھے تو اُس کے ماں باپ خواہ کتنے بڑے ذہین اَور ترقی یافتہ ہوں، جنگل میں پلنے والا یہ بچّہ زیادہ سے زیادہ ایک آدم خور اِنسان بن سکے گا اَور بس۔ اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک فرد کو جب اِنسانی معاشرے میں رہنا میسّر نہ ہو تو وُہ انسانیت کے وصف ہی سے محروم ہو جاتا ہے۔ اَور اگر وُہ اِنسانی معاشرے میں پلے بڑھے اَور جسمِ اِنسانیت کے ایک عضو کی حیثیّت سے پروان چڑھے تو وُہ تہذیب و تمدّن کے زیور سے آراستہ ہو کر آدم خور کی بجائے ایک ترقی یافتہ اِنسان بنتا ہے۔

جسمِ انسانیت (معاشرے) کا یہ کتنا بڑا اِحسان ہے، لازم ہے کہ اِس احسان کو بھلایا نہ جاتے بلکہ اِس اجتماعی جسم کی صحت و ترقی کا پُورا خیال رکھا جائے

کیونکہ اس کے بگاڑ کا اثر تمام اعضاء (افرادِ انسانی) پر پڑے گا۔

ہر معاشرہ اپنے افراد کے متعلق اِس بات کا تعیّن کرتا ہے کہ وُہ ارتقاء کے کِس مرحلے میں ہیں جس معاشرے میں ہم پیدا ہُوئے اُسے اِرتقاء کے موجُودہ مرحلے تک پہنچانے میں ہمارے اسلاف کا بڑا حِصّہ ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ اس جسمِ اجتماعی کی صحت و ترقی کے متعلق اپنے اُوپر فرض ہونے والی مساعی میں کوتاہی نہ کریں تاکہ ہماری آنے والی نسلیں جس معاشرے میں آنکھ کھولیں وُہ ارتقاء کی اگلی منزل میں قدم رکھ چکا ہو۔ معاشرے کی اِس صحت و ترقی سے جہاں آنے والی نسلوں کو فائدہ پہنچے گا وہاں ہمیں بھی ایک اچھے معاشرے میں سکُون و اِطمینان سے رہنا نصیب ہو گا۔

معاشرے کی صحت و ترقی کے لئے ہر فرد کو ـــــ جو کہ اس اجتماعی جسم کا ایک حِصّہ ہے ـــــ اپنے اُوپر یہ لازم کر لینا چاہیئے کہ میں اپنی صلاحیّتوں سے جو فوائد حاصل کروں گا اس سے میرے اجتماعی جسم (معاشرے) کے دُوسرے اعضاء (افرادِ انسانی) کو بھی اِستفادہ کا حق حاصل ہو گا اور میری کمائی صرف مجھ ہی پر خرچ نہ ہو گی بلکہ پُورے اجتماعی جسم کی نشو و نما کے لئے صرف ہو گی۔

ایثار و ہمدردی اور وحدت و یک جہتی کا یہ اِحساس معاشرے کے لئے امن و سکون کا ضامن ہے۔ اِس کے برعکس اِنفرادیّت پرستی اور ہر حال میں اپنے ذاتی مفاد کا حصُول ـــــ خواہ دُوسرے ہلاک ہی ہو جائیں ـــــ معاشرے کو اِنتشار

اُور بے چینی کا شکار بنا دیتا ہے۔ معاشرے کو اِس تباہی سے بچانے کے لیئے ضروری ہے کہ ہر فرد، وحدتِ اِنسانیّت کا اِحساس پیدا کرے اُور اِس کے تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیئے دُوسرے افراد کی مُخلِصانہ اَور بھرپُور امداد کرے۔

مزدور کی زندگی مطمئن بنائیے

سرمایہ داروں کا ایک اپنا فلسفہ ہے کہ مزدور کو ہمیشہ معاشی بدحالی میں مبتلا رکھو، اس کی فکری صلاحیتوں کو مفلوج کر دو، اسے صرف اتنی اُجرت دو جس سے بمشکل اس کی رُوح اور بدن کا رشتہ قائم رہ سکے اور بس، تاکہ وُہ ایک بے زبان اور بے عقل مشین کی طرح شب و روز بے چُون وچرا اپنے آقا کے سرمایہ میں اضافہ کرتا رہے اس کی زندگی میں کبھی اطمینان پیدا نہ ہونے دو کہ کہیں اِس کی فکری صلاحیتیں بیدار نہ ہو جائیں۔ کہیں اسے اپنے انسان ہونے کا شعور نہ ہو جائے اور وُہ بھی برابری کا دعویٰ کر بیٹھے، اسے یومیہ صرف اتنا دو جس سے وُہ کچھ بچا نہ سکے تاکہ ہر وقت ہمارا محتاج رہے، کسی وقت بھی ہمارے اشارۂ ابرو کی مخالفت کا تصوّر تک دل میں نہ لا سکے۔ ہمیں ناراض کر کے دو دن بھی نہ گذار سکے۔ اس کے رزق پر ایسے قبضہ رکھو جیسے سوئچ کا بجلی کے بلب پر ہوتا ہے کہ جُونہی سوئچ بند ہوا روشنی ختم، اسی طرح جُونہی مزدور کارخانے سے الگ ہوا روٹی ختم، تاکہ اس کی اور اس کے کنبے کی عزّت و عصمت ہمارے قبضے میں رہے، اُسے اپنی شیطانی ہوس اور حیوانی زندگی کا شکار بنایا جا سکے۔ اس کی عزّت لُوٹی جائے تو اُف نہ کر سکے اور اس کی جان لی جائے تو تڑپ نہ سکے۔

یہی وُہ فلسفہ ہے جس کے پیشِ نظر کارخانہ دار، مزدُور کو کم سے کم تنخواہ دیتا ہے اَور جب اس سے مطالبہ کیا جائے کہ تنخواہ میں اضافہ کرو تو بڑی معصُومیّت سے حساب کرنے بیٹھ جاتا ہے، اچھا تمہاری تنخواہ پینتالیس روپے ماہوار ہے، ارے یہ تو بہت کافی تنخواہ ہے اَور کیا چاہتے ہو؟ اور اگر خود ان صاحب سے کہا جائے کہ جناب! آپ نے جو بنک میں کئی لاکھ روپیہ جمع کر رکھا ہے اس کی کیا ضرورت اور یہ جو مزدُور کے خوُن پسینہ کی ساری کمائی ہڑپ کر جاتے ہو اس کا کیا جواز؟ چلو تم پینتالیس کی بجائے پینتالیس سو روپے ماہانہ پر اکتفا کر لو مگر باقی رقم تو مزدُوروں میں بانٹ دو۔ کارخانہ دار اس عرضداشت پر سخت برہم ہو جائے گا۔ اسے منظور کرنا تو درکنار اُلٹا مزدُور کو اس کی گستاخی پر سزا دینے سے بھی دریغ نہیں کرے گا کیونکہ وُہ اپنے آپ کو ایک اُونچی قسم کی مخلوق سمجھتا ہے مگر کون اسے سمجھائے کہ مزدُور بھی تیرے ہی جیسا اِنسان ہے۔ اسے بھی زندہ رہنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا تجھے۔ جس طرح تیری بہت سی ضروریات ہیں، مزدُور بھی یہیں کا بسنے والا اِنسان ہے اس کی بھی ضرورتیں ہیں۔ اسی کی محنت نے تیرے ایک لاکھ کے سرمایہ کو ایک کروڑ میں بدل دیا۔ اب یہ کِس قدر ظلم ہے کہ تُو تو اس کی پیدا کی ہوئی دولت سے گلچھرّے اُڑائے اَور غریب اِنتہائی بُنیادی ضرورتوں تک کو ترسے۔

نظامِ حکومت ایسا ہونا چاہیئے جس میں ہر شخص کو یکساں طور پر جینے کا حق حاصل ہو اَور کوئی اپنی عیش و نشاط کی خاطر دُوسروں کی زندگیوں پر ہاتھ صاف نہ

کر سکے۔ امن جبھی قائم ہو سکتا ہے کہ دھاندلی قانوناً بند کر دی جائے، دُوسروں کا خون نچوڑنا قانوناً جُرم قرار دے دیا جائے مزدوروں کو پیس پیس کر اور ان کی زندگیوں کو گھٹا گھٹا کر اپنی زندگیاں بڑھانے کا رُجحان ختم کر دیا جائے ورنہ طبقاتی کشمکش بڑھتی ہی جائے گی اور کبھی اچانک اس کا "بم" ایسے پھٹے گا کہ امن سرپیٹ کر رہ جائے گا۔

ظالم طبقہ کو مظالم سے روکنے کے لئے انسانیت افروز اور مؤثر قانونی پابندیاں عائد کرنی ضروری ہیں صرف پند و نصائح سے کام نہیں چل سکتا۔ کیا دنیا کی تاریخ میں کوئی ایسا دور بھی گزرا ہے جس میں صرف پند و نصائح سے کام چل گیا ہو اور قانون و تعزیر کی کوئی ضرورت نہ پڑی ہو؟ ہر زمانے میں عدل و انصاف اور امن و امان کی خاطر قانون بنے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزائیں ہوئیں۔ نہ دورِ ماضی میں لاتوں کے بھوت باتوں سے مانے ہیں اور نہ زمانہ حال میں مان سکتے ہیں۔ اس لئے امن و انصاف کی خاطر لاتوں کی جگہ لاتیں اور باتوں کی جگہ باتیں استعمال کی جائیں۔

اسی طرح یہ خیال کرنا کہ اگر مزدور ہر وقت اور ہر حال میں وفاداری بشرطِ استواری اور خاموشی سے ظلم سہنے پر کاربند ہو جائیں تو مالک خود بخود عدل و مساوات کی طرف مائل ہو جائیں گے، انتہائی درجہ کی خود فریبی ہے۔ ظالم کے سامنے لیٹ جانا اسے ظلم و ستم سے روکتا نہیں بلکہ مظالم توڑنے کی راہ میں مزید آسانی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر تاریخ بھی کوئی چیز ہے تو ہم اس کے مطالعے کی بنا پر واشگاف طور پر کہہ

سکتے ہیں کہ ظالموں کے سامنے لیٹ جانے سے کبھی بھی اِنسانیت کی بھلائی کی راہ نہیں کھُلی بلکہ کھلے ہُوئے راستے بھی بند ہو گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب سے مزدُور ہڑتالیں کرنے لگے ہیں ان کی حالت کی طرف کچھ توجہ ہونے لگی ہے اور جب تک یہ خاموشی سے گردن جھکائے رہے ان کے گرد ظلم کے شکنجے اور بھی کسے جاتے رہے اور گردن کی رسیاں مزید تنگ ہوتی گئیں۔

اب مزدُور بیدار ہو چکا ہے اسے اپنی طاقت کا اِحساس ہو گیا ہے، سرمایہ داری کی کوئی چٹان اسے منزل تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی لہٰذا عقل مندی سے کام لیتے ہوئے نہایت امن وامان سے سب اِنسانوں کو ان کے تمام جائز حقوق سے بہرہ ور کیا جائے کیونکہ پُر امن طور پر مساوات کا قیام یقیناً سب کے حق میں مفید ہو گا اور اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ مزدُوروں کا اِضطراب سرمایہ داروں کو ایک ایسا دن بھی دکھا دے جب کہ سرمایہ داری کی دھجیاں فضائے بسیط میں اُڑ رہی ہوں لہٰذا ہر حکومت کا فرض ہے کہ مزدُوروں کی حالت پر خصُوصی توجہ دے اور ان کی زندگیاں مطمئن بنائے۔

ہر مملکت میں کام کے مختلف شعبے ہوتے ہیں کسی میں دانش ور کام کرتے ہیں، کسی میں مزدُور اور کسی میں کسان۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ سب کے سب دانشوری کے شعبہ میں لگ جائیں کیونکہ اِس طرح ملکی معیشت تباہ و برباد ہو کر رہ جائے گی۔ پس کارخانوں اور کھیتوں کا وجود ضروری اور ان میں کام کرنے والے

طبقے کا ہونا لازم ہے اِس کیلئے ضرورت اِس امر کی ہے کہ محنت کش طبقہ کی معاشی بہتری کا ایسا سامان مہیّا کیا جائے کہ یہ اپنے پیشے میں بے اطمینانی محسوس نہ کرے، اسے تمام بنیادی سہولتیں حاصل ہوں، ترقی کے راستے اس پر کھُلے ہوں۔

جس طرح سرمایہ داروں کی بے جا رعایتیں خوش آئند نہیں اِسی طرح برسرِ اقتدار طبقہ کے ظالمانہ اختیارات اَور عوامی محاسبے سے بالاتری بھی ملک میں بے چینی اَور بے اِطمینانی کی آگ بھڑکا دیتی ہے جس سے عوام میں یہ تاثر پیدا ہونے لگتا ہے کہ بدقسمتی سے ہم لوگ چُونکہ برسرِ اقتدار نہیں اِس لیئے ہمیں مطمئن زندگی گزارنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اِس تاثر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ "حکومت" کا لفظ عوام کے لیئے گالی کے مترادف بن جاتا ہے کیونکہ "حکومت" ان کے نزدیک نام ہوتا ہے اتفاقاتِ زمانہ سے برسرِ اقتدار آجانے والے چند لٹیروں کا ایسے حالات میں عوام کو برسرِ اقتدار طبقہ سے کوئی ہمدردی نہیں رہتی بلکہ ان کی ہر وقت یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اِس طبقہ کی نیّا ڈبو دی جائے۔ چنانچہ خفیہ سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔ اَور بار بار حکومت کو پریشان کیا جانے لگتا ہے۔ اس کے جواب میں اگر حکومت تشدّد کا نسخہ اِستعمال کرتی ہے تو یہ قطعاً غیر دانش مندانہ اقدام ہوتا ہے اس سے عوام دب نہیں سکتے بلکہ ان میں اِنتقامی جذبات خطرناک انداز میں اُبھرنے لگتے ہیں۔ لہذا ہونا یہ چاہئیے کہ فوراً ان اسباب کو دُور کیا جائے جو بے چینی کا باعث ہیں۔ اِن اسباب

میں بہت اہم عوام کی معاشی بدحالی ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اسے جلد از جلد دُور کرنا ضروری ہے۔

اب کسی کو بھی اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیئے کہ محنت کش طبقہ سختی اَور تشدد سے دب جائے گا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ محنت کش کو اپنی طاقت کا احساس ہو چکا ہے۔ وُہ اپنی اہمیّت جاننے لگ گیا ہے پھر اِس کی صفوں میں اِتحاد و اِتفاق بھی پیدا ہو چکا ہے اِس لئے اب اس پر تشدّد کرنے سے خود تشدّد کرنے والوں کا پتّہ کٹ جائے گا۔ لہٰذا نہایت شرافت سے اس غریب طبقہ کو معاشی اِطمینان سے بہرہ ور کیا جائے اَور اس کی تمام بُنیادی ضرورتوں کو پُورا کیا جائے۔

بندۂ مزدور کے اوقات

ملکی استحکام و ترقی میں مزدور ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وہ طبقہ ہے جو اپنا خون پسینہ ایک کر کے ملک کی خوش حالی کا سامان مہیا کرتا ہے مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ اس غریب طبقہ کے حقوق سے ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیا جاتا رہا ہے اور ایک مٹھی بھر امیر طبقہ کی خوشنودی کے لئے ان غریبوں کے خلاف انتہائی سے انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کیا گیا۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس مظلوم طبقہ کو صرف اس بناء پر کئی دفعہ گولیوں کا نشانہ بنایا گیا کہ انہوں نے اپنا حق کیوں مانگا ہے؟ کیا پاکستان کی سولہ سالہ تاریخ میں اس امر کی بھی کوئی شہادت ملتی ہے کہ کسی کارخانہ دار کو غریبوں پر ظلم کرنے کے سبب سزائے موت دی گئی ہو؟ ایسا کبھی نہیں کیا گیا۔ ہمیشہ اسی کمزور طبقہ کو تہ تیغ کیا جاتا رہا ہے جو سوئے اتفاق سے ناخواندہ اور غریب ہے اور جس کی اونچے ایوانوں تک رسائی نہیں۔ یہ بندۂ مزدور ہی تو ہے جس نے ایک کروڑ کے سرمایہ کو اپنی محنت سے دس کروڑ بنا دیا مگر اس زائد نو کروڑ میں سے ایک حقیر سی اجرت کے سوا مزدور کو کیا ملا؟ ساری رقم سرمایہ دار کھا گئے۔ جب مزدور نے ان سے نہائت پُر امن طور پر یہ مطالبہ کیا کہ بندہ پرور ہمارے خون پسینہ

کی کمائی سے کچھ ہماری ضروریات پر بھی صرف فرمائیے تو اس کے جواب میں سرمایہ داروں کی طرف سے پولیس طلب کر لی گئی، کسی بہانے گولیاں برسنے لگیں۔ کتنے ہی غریبوں کو وہیں چھلنی کر دیا گیا اور سینکڑوں کو جیلوں میں گلنے سڑنے کے لئے ڈال دیا گیا۔ ایک رکن قومی اسمبلی کے دعویٰ کے مطابق صرف ایک سال میں ایک ہزار سے زائد مزدور گرفتار کئے جا چکے ہیں یہ تعداد اُن مزدوروں کی مجموعی تعداد سے زیادہ ہے جو ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۲ء تک گرفتار کئے جا چکے ہیں۔ یہ طرزِ عمل، مملکت کے حق میں قطعاً خوش آئند نہیں۔

مزدوروں کے ساتھ تو یہ سلوک ہے! اِدھر کارخانہ داروں کی ہر جائز و ناجائز ناز برداری کی جا رہی ہے۔ انہیں مزدوروں کے استحصال کی کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ ایک کارخانہ کے پہلو سے دوسرا کارخانہ جنم لے رہا ہے دولت سمٹ سمٹا کر چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو رہی ہے اور مزدور بیچارے کی حالت دن بہ دن قرونِ وسطیٰ کے غلاموں کی سی ہوتی جا رہی ہے۔ یہ غریب اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ سکونت، علاج اور بچوں کی تعلیم کے لئے ترس رہا ہے مگر اس پر رحم کھانے کی کسی کو توفیق نہیں اور اگر کبھی یہ اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کرتا ہے تو خوش کُن وعدوں یا طاقت سے اس کی آواز دبا دی جاتی ہے۔ ایک ایسی حکومت کو یہ طرزِ عمل قطعاً زیب نہیں دیتا جو جمہوریت کی مدعی، انسانی حقوق کے عالمی منشور سے وابستہ اور بین الاقوامی ادارہ محنت کی رُکن ہے۔

واقعات و مشاہدات کی روشنی میں یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ سرمایہ دار محض واعظانہ پند و نصائح سے مزدوروں کی فلاح و بہبود کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا اس لئے حکومت کا فرض ہے کہ سرمایہ داروں کے متعلق اپنی نرم پالیسی کو بدل لے اور ان پر یہ بات واضح کر دے کہ وہ مزدوروں کو ان کے تمام جائز حقوق سے بہرہ ور کریں ورنہ حکومت انہیں لائسنس اور دوسری مراعات سے محروم کر دے گی اس کے ساتھ ساتھ حکومت کو وہ تمام پابندیاں بھی اُٹھا دینی چاہئیں جو سرمایہ داروں کے زیرِ اثر، مزدوروں کی ہڑتال کے حق پر لگائی گئی ہیں تاکہ کارخانہ داروں اور مظلوم مزدوروں میں کچھ توازن پیدا ہو سکے نیز حکومت سے پُرزور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ ان غریبوں کو بدنام کرنے کی کسی وزیر کو اجازت نہ دے۔ ہمارے وزراء کرام کی یہ عادت کریمہ بن چکی ہے کہ جونہی مزدوروں نے اپنا حق طلب کیا ان مفتی صاحبان نے بھانت بھانت کی بولیاں بولنی شروع کر دیں اور مزدوروں پر طرح طرح کے فتوے لگانے لگے۔ قومی لیڈروں کا یہ اندازِ فکر ان کے حق میں قطعاً نیک فال نہیں۔ یہ ذلیل طریقہ ہے۔ ایسے وزیر صاحبان کو چاہیئے کہ تحقیقاتی عدالت کی طرف رجوع کر کے اپنے الزامات ثابت کریں بصورتِ دیگر حکومت کو چاہیئے کہ ان غیر محتاط وزیروں کو برطرف کر دے جو غریب مزدوروں کی رہی سہی ساکھ بھی خاک میں ملانا چاہتے ہیں۔

پاکستانی قوم صرف چند سرمایہ داروں ہی کا نام نہیں بلکہ وہ لاکھوں مزدور بھی پاکستانی قومیت سے تعلق رکھتے ہیں جن کی قوتِ بازو سے تمام ملکی صنعت

قائم ہے پس ملک کی خوش حالی تبھی ہو سکے گی جب کہ اِس غریب طبقہ کو بھی اِس کے تمام جائز حقوق سے بہرہ ور کیا جائے گا۔

ترجمانِ حقیقت

اگست ۱۹۶۳ء

کان کن مزدوروں کی جانیں بچائیے

خواہ کوئی صدرِ مملکت ہو یا غریب مزدور، دونوں اِنسان ہیں اور دونوں کی جانیں قیمتی ہیں جس طرح کسی حکومت کے لیئے ضروری ہوتا ہے کہ "معززین" کی حفاظت کا اِنتظام کرے اُسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہوتا ہے کہ ملک کے غریب باشندوں کی جانوں کے تحفّظ کا بھی بندوبست کرے مگر نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ دولت مند اور صاحبِ اقتدار حضرات کی جان و مال کے تحفّظ کا تو مکمل انتظام کیا جاتا ہے مگر غریبوں پر کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں دی جاتی جس سے کتنی ہی قیمتی جانیں موت کی نذر ہو جاتی ہیں۔

پچھلے چند مہینوں میں اربابِ حکومت کی غفلت سے کوئلے کی کانوں میں ایسے المناک حادثے ہوئے ہیں جنہوں نے رونگٹے کھڑے کر دیئے۔ پُورے طور پر حفاظتی اِنتظامات نہ ہونے کے سبب وہاں دس غریب مزدور تو ہمیشہ کی نیند سو گئے اور پندرہ زخمی ہوئے۔ کوئٹہ سے ساٹھ میل دُور کوئلے کی کانوں کے علاقے آب گم میں ۱۵۔جولائی کو دو مزدور زہریلی گیس کے سبب مر گئے۔ ۲۷۔جولائی کو پھر دو افراد اِسی سبب لقمۂ اجل بن گئے۔ یکم اگست کو ایک مزدور کوئلے تلے زندہ دفن ہو گیا جس سے اس کی زندگی ختم ہو گئی۔ ۱۳۔ اگست کو اسی طرح ایک اور

مزدور جاں بحق ہوا۔ ۲۴ اگست کو ایک مزدور کان کی چھت تلے دب کر ختم ہو گیا۔ ۲۵ اگست کو ایک اور قیمتی جان ضائع ہو گئی۔ ۲۷ اگست کو ایک مزدور کا سیفٹی لیمپ گر پڑا جب وہ اُٹھانے کے لیے جھکا لیمپ تو مل گیا مگر زہریلی گیس اس پر چھا گئی جس کے سبب وہ بے ہوش ہو گیا۔ اسے اسی حالت میں باہر تو نکال لیا گیا مگر چونکہ کمپنی کے پاس آکسیجن گیس اپارٹیس نہیں تھا اس لیے مزدور کی جان نہ بچائی جا سکی۔

یہ کس قدر غیر انسانی تفریق ہے کہ اگر اُمراء و وُزراء میں سے کسی کی طبیعت ناساز ہو جائے تو اس کے علاج کا پاکستان ہی میں نہیں بلکہ بسا اوقات بیرونی ممالک میں بھی مکمل انتظام کر دیا جاتا ہے لیکن غریب مزدور جو ملکی ترقی و استحکام میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دے دیتا ہے مگر اس کی طبّی امداد کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا کیا یہ انتہائی ظلم نہیں کہ جس غریب کی شبانہ روز کی محنت و مشقّت نے دولت کو پیدا کیا اُسے تو پوچھا نہیں جاتا لیکن دوسری طرف امیر و مقتدر حضرات کو محض اشیاء ضرورت ہی نہیں بلکہ عیش و عشرت کا ہر قسم کا سامان بھی بڑی فراخ دلی سے مہیّا کیا جاتا ہے اور انہیں غریبوں کے استحصال اور ان کے گاڑھے خون پسینے کی کمائی سے گلچھرّے اُڑانے کی کھلی چھٹی دے دی جاتی ہے۔

کوئٹہ کے اسی علاقہ میں ۲ ستمبر کو ایک اور دلدوز واقعہ پیش آیا۔ جعفری کول کارپوریشن کی کوئلے کی ایک کان میں دس مزدور کام کر رہے تھے ان کا

ایک ساتھی زہریلی گیس سے متاثر ہو کر بے ہوش ہو گیا اور اس کا سیفٹی لیمپ بھی بجھ گیا باقی مزدور یہ دیکھتے ہی بھاگ کر نکل آئے۔ چونکہ کمپنی نے حفاظتی سامان نہیں رکھ رکھا تھا اس لئے بے ہوش مزدور کو جلدی سے نکالا نہ جا سکا، کمپنی نے گیس کے نقاب اور دوسرا سامان کوئٹہ شہر سے عاریۃً منگوایا تب کہیں جا کر مزدور کو گیس سے متاثر ہونے کے چوبیس گھنٹے بعد نکالا جا سکا مگر اس وقت وہ موت کی نیند سو چکا تھا۔

یہ حادثات نہایت ہی المناک ہیں۔ ہر وہ شخص جس کے دل میں انسانیت دوستی کا ذرا سا جذبہ بھی موجود ہے ان پر مضطرب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اربابِ اقتدار سے پُرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ ان خطرناک کانوں میں اس وقت تک مزدوروں سے کام نہ کرائیں جب تک کہ مکمل طور پر احتیاطی و حفاظتی تدابیر بروئے کار نہ لائی جا چکی ہوں۔

ترجمانِ حقیقت
اکتوبر ۱۹۶۳ء

امن کی بنیاد

اِنسان کم از کم دورِ تاریخ سے مدنی چلا آتا ہے۔ مدنی کے معنی ہیں مِل جُل کر زندگی بسر کرنے والا۔ ہر دور میں اِس کی کچھ ایسی ضرورتیں رہی ہیں جنہوں نے اسے مدنیت کے دائرے سے باہر نہیں نکلنے دیا۔ اَور اب تو ان ضروریات کی جڑیں بہت ہی گہری اَور مضبوط ہو چکی ہیں۔ یہ ضرورتیں مختلف اقسام میں بٹی ہوئی ہیں۔ کچھ وُہ ہیں جن کا تعلق کھانے پینے سے ہے، کچھ وُہ ہیں جن کا پہننے اوڑھنے وغیرہ سے ہے اَور جُوں جُوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ہر فرد کی ضرورتوں میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔

دورِ تمدّن کے ہر حصّے میں اِنسانی ضروریات کی فہرست اِس قدر ضرور رہی ہے کہ کوئی فرد، دُوسروں سے میل جول رکھے بغیر انہیں پُورا نہیں کر سکتا۔ جو روٹی اسے مِلتی ہے اسے اپنی آخری شکل تک پہنچنے میں کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے مثلاً پہلے گیہوں کا بیج مہیّا کیا گیا، پھر اس کے لئے کھیت تلاش کیا گیا، پھر اس میں کلبہ رانی کے لئے کوئی چیز، پھر کلبہ رانی، پھر پانی دیا گیا، عرصہ تک حفاظت کی گئی، کاٹا گیا، پھر اس میں دائیں چلانے کا کام ہُوا، پھر صاف کیا گیا، دانوں کو پسوایا گیا آگ مہیّا کی گئی، پھر لوہے وغیرہ کا توا پیدا کیا گیا تب کہیں جا کر روٹی تیار ہوئی اگر

ایک اِنسان دُوسروں سے مِلے جُلے بغیر اپنا کوئی کام کرنا چاہے تو صرف ایک چپاتی تیار کرنا بھی اس کے لیئے ناممکن ہو جائے ۔ یہی حال دُوسری ضروریات کا بھی ہے انہی دُشواریوں کے پیشِ نظر کام تقسیم ہُوئے ۔ ہر فرد کسی نہ کِسی شعبے سے منسلک ہو گیا اور مِل جُل کر ضروریاتِ زندگی مہیّا کی جانے لگیں ۔ زمین والے نے روٹی مہیّا کی ، بافندے نے کپڑا تیار کیا ، کسان نے گندم مہیّا کی ، نانبائی نے روٹی تیار کی ۔ بافندہ گیہوں کے لیئے کِسان کے پاس گیا تو کِسان کپڑے کے لیئے بافندے کے پاس آیا ۔

اِنسانی ضرورتوں کے پیشِ نظر جس طرح چند افراد ایک دُوسرے سے معاملات کرتے ہیں اسی طرح ایک کُنبہ دُوسرے کُنبے سے ، ایک قبیلہ دُوسرے قبیلے سے اور ایک ملک دُوسرے ملک سے معاملات کرنے پر مجبُور ہوتا ہے آپس کے ان معاملات اور باہمی میل ملاپ کے دوران بسا اوقات کئی قسم کی بے اعتدالیاں ہو جاتی ہیں جو آخر کار دنگا فساد اور خُون خرابے پر منتج ہوتی ہیں ظاہر ہے یہ خون خرابا ، اِنسانیت کے حق میں سراسر ہلاکت ہے ۔ قوموں کی قومیں اس کی نذر ہو جاتی ہیں ۔ اِنسانیت کو اِس تباہی سے بچانے اور امن وامان میں رکھنے کے لیئے اُس سرچشمہ کو بند کرنا ضروری ہے جس سے ظُلم وستم اور فتنہ وفساد کے دھارے پھُوٹتے ہیں ۔

یہ سرچشمہ نفسِ اِنسانی کی تین قوتوں کا فساد ہے ۔ جب تک ان کی اِصلاح نہ

کی جائے ظلم اور فساد کا دروازہ بند نہیں ہو سکتا۔ وُہ تین قوتیں یہ ہیں قوتِ عقلیہ، قوتِ شہوِیہ (خواہشات کی طاقت)، قوتِ غضبیہ (غصے کی طاقت)، اِنسان کو آگ میں کُودنے سے روکنے والی، قوتِ عقلیہ ہے۔ کِسی میٹھی چیز کو دیکھ کر للچانے والی، قوتِ شہویہ ہے اور کِسی ناپسندیدہ بات کے ہو جانے پر بپھر جانے والی، قوتِ غضبیہ ہے۔ یہ تین قوتیں جہاں مظالم کا سرچشمہ ہیں وہاں اِنسانی بقا کے لئے بھی بے حد ضروری ہیں۔ دراصل اِن قوتوں میں دو پہلو ہیں۔ ایک صلاح کا جو خیر کا سرچشمہ ہے اور ایک فساد کا جو شر کا سرچشمہ ہے۔ نسلی و علاقائی عصبیتیں قوتِ عقلیہ کے فساد کا کرشمہ ہیں۔ زناکاری اور رشوت ستانی کا منبع قوتِ شہویہ کا فساد ہے۔ اور قتل و غارت کا سرچشمہ قوتِ غضبیہ کا فساد ہے۔ اِن بُرائیوں اور فِتنوں سے محفوظ رہنے کے لئے اِن تینوں قوتوں میں توازن و اعتدال پیدا کرنا ضروری ہے۔ قوتِ عقلیہ جو کہ نفسِ اِنسانی میں ایک جائز اور قانونی حاکم ہے اِس کی اِصلاح کی صُورت تعلیم ہے۔ جس قدر زیادہ، اعلیٰ اور مفید تعلیم ہو گی، اسی قدر اس قوت میں صلاح کا غلبہ ہو گا اور جس قدر کم، گھٹیا اور مُضر تعلیم ہو گی اسی قدر فساد کا غلبہ ہو گا۔ قوتِ شہویہ اور غضبیہ کی اِصلاح کی صُورت ضبطِ نفس یعنی ان قوتوں پر قابو پانا اور اُنہیں اپنی حدُود سے آگے نہ بڑھنے دینا ہے۔

یہی دونوں چیزیں یعنی اچھی تعلیم اور ضبطِ نفس، امن کی بُنیاد ہیں۔ اور اِن کا فقدان، فساد کا سرچشمہ۔ امن جبھی قائم ہو سکتا ہے کہ اس کی بُنیاد صحیح طور

پر قائم کی جائے اور فساد کا سرچشمہ بند کر دیا جائے۔ کیونکہ فساد کو اِس کا سرچشمہ بند کر کے تو روکا جا سکتا ہے۔ مگر سرچشمہ چھوڑ کر دُور ہٹ کے جو بند باندھے جاتے ہیں اُن سے فساد کبھی نہیں رُکا کرتا۔

عورت اور اس کی آزادی

جس گاڑی کے دو پہیّوں میں سے ایک بہت بڑا ہو اور دوسرا بالکل چھوٹا تو ایسی گاڑی سے تیز روی تو بجائے خود رہی، خیریت سے آہستہ خرامی کی توقع بھی مشکل ہی سے رکھی جا سکتی ہے۔

انسانیت کی گاڑی کے بھی دو پہیّے ہیں۔ مرد اور عورت، مگر حیوانی سطحِ زندگی نے ان میں عدم مساوات کی ایک بہت بڑی خلیج حائل کر دی، ان کی حیثیت برابر کے شریک کی نہ رہی بلکہ ایک حاکم ہو گیا اور دُوسرا محکوم۔ زندگی کے تمام اہم امور پر حاکم چھا گیا اور محکوم کی حیثیت محض ایک رنگین کھلونے یا ایک دل پسند گڑیا کی رہ گئی جس سے حاکم اپنے جذبۂ عیش و نشاط کی تسکین کرتا ہے۔ ان دونوں پہیّوں کی اس المناک نابرابری نے انسانیت کی رفتارِ ترقی کو اِس بُری طرح متاثر کیا کہ یہ گاڑی تیز روی کی بجائے رینگنے پر مجبور ہو گئی اور مہینوں کا سفر سالوں میں طے کرنے لگی۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر عورت کو ـــــ جو ہر دور میں انسانی آبادی کا قریباً نِصف رہی ہے ـــــ انسانیت کے عقلی و تمدّنی اِرتقا میں برابر کا شریک کر لیا جاتا تو ترقی کا موجودہ مرحلہ جس سے ہم گزر رہے ہیں آج سے کئی سو برس پہلے

دُنیا کے نقشے پر اُبھر چکا ہوتا اور آج ہم اِرتقار کی اُس منزل سے گزر رہے ہوتے جسے اب سے کئی سو سال بعد آنا ہے۔

عورت کی تذلیل

حقیقت یہ ہے کہ عورت کی محکومی و غلامی سے ساری انسانیت کا عظیم نقصان ہوا مگر افسوس کہ حیوانی جذبۂ تغلب نے اس کا اِحساس نہ ہونے دیا اور عورت کے حقوق پامال ہوتے چلے گئے۔ نہ صرف یہ کہ اِس مظلوم طبقہ کو محکوم و غلام بنایا گیا بلکہ اس کے متعلق انتہائی ذِلّت آمیز تصوّرات بھی پیش کئے گئے۔ کِسی نے کہا عورت لغزش کا دُوسرا نام ہے، کہیں یہ کہا گیا کہ عورت ایک ذلیل مخلوق ہے، عورت برہما کے تلوے سے پیدا کی گئی ہے، عورت گناہوں کا شیطان ہے، عورت گناہِ آدم کی اصل ذمہ وار ہے، اگر یہ سالن میں نمک زیادہ ڈال دے تو اسے شرعی طلاق دی جاسکتی ہے، شوہر مر جائے تو عورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رہتا، عورت کی رُوح مرنے کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ کچھ عرصہ تو یہی چیز اِختلافی رہی کہ عورت میں رُوح ہے بھی یا نہیں۔ یہ ہیں وُہ فتوے جو عہدِ گذشتہ میں عورت کے متعلق صادر کئے گئے۔ شاید آج فِکری سطح پر یہ کسی کے نزدیک درست نہ رہے ہوں۔

اِمتیازی سلُوک

مگر اب بھی عورت کے ساتھ اِمتیازی سلوک اپنی گھناؤنی شکل میں موجود ہے۔ آئے دِن اخباروں میں ایسی خبریں شائع ہوتی ہیں کہ شوہر نے بدچلنی کے شبہ میں بیوی کو قتل کر دیا، بھائی نے بہن کو مار ڈالا۔ بدچلنی

واقعی بُری چیز ہے مگر مرد اور عورت کے معیارِ عصمت میں تفریق کیوں؟ آخر غیرت و حمیت کے مظاہرے کے لئے عورت ہی کو قربانی کا جانور کیوں تصوّر کر لیا گیا ہے۔ ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ جب کسی کا بھائی یا بیٹا بد چلن ہو جائے تو وہ اس پر بھی ایسی ہی غیرت کا مظاہرہ کرے[1]۔ مگر لڑکوں کی اِس قسم کی خطاؤں کو بڑی شفقت سے معاف کر دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی ازراہِ ہمدردی کہے کہ لڑکے کے اطوار اچھّے نہیں تو بڑی سادگی سے جواب دیا جاتا ہے کہ جوانی کی عمر ہی ایسی ہوتی ہے مگر کسی لڑکی کے متعلق اِس قِسم کی کوئی غلط سی خبر بھی پھیل جائے تو ہمارے تقویٰ گزیدہ معاشرے میں اُسے اِنتہائی ذلیل و خوار بلکہ گردن زدنی قرار دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ لڑکے کی بد چلنی بھی اتنی ہی بُری ہے جتنی کہ لڑکی کی۔ لیکن عورت کی خطا پر تو سب آتش زیر پا ہو جاتے ہیں مگر مرد کے معاملے میں غیرت کی ہانڈی میں کبھی اُبال نہیں آتا۔

اِسی طرح مردوں کو کھُلا پھرنے کی اجازت ہوتی ہے جبکہ عورت کے متعلق یہی کوشِش ہوتی ہے کہ وُہ گھر کی چار دیواری میں بند رہے۔ اگر کبھی باہر نکلے بھی تو اس کا پہرہ دینا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ عورت پر یہ پابندی کیوں عائد کی جاتی ہے۔ کیا اِس وجہ سے کہ باہر آنے جانے سے اِس کے بد چلن ہونے کا اندیشہ ہے؟ مگر یہ اندیشہ تو مردوں کے متعلق بھی یکساں طور پر ہو سکتا ہے۔ یا یہ وجہ

---

[1] یاد رہے کہ کوئی شخص اِس کا مجاز نہیں کہ کسی فرد کو خواہ وُہ عورت ہو یا مرد کسی بھی جرم کی پاداش میں قتل کرے۔ بوقتِ ضرورت ایسی سزائیں دینا صرف حکومت کا کام ہے۔ جسن

ہے کہ باہر نکلنے سے غنڈے، عورتوں پر آوازے کستے ہیں مگر عورت کو قید رکھنے کے لئے یہ دلیل بھی درست نہیں کیونکہ بیہودگی کا مظاہرہ تو غنڈوں کی طرف سے ہوتا ہے آخر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ غنڈہ گردی کرنے والوں کو تو کھلے بندوں دندناتے پھرنے کی اجازت ہو مگر بے قصور عورتوں کو گھروں میں بند کر دیا جائے کہ باہر نہ نکلو غنڈے چھیڑیں گے۔ حالانکہ چاہیئے تو یہ کہ شریف افراد کی عزّت بچانے کے لئے غنڈوں کو قید رکھا جائے تاکہ وُہ اپنی شر انگیزی کا مظاہرہ نہ کر سکیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کتنی ہی بار سڑکوں پر گاڑیوں میں ٹکریں ہوئیں مگر کسی بقراطنے اس کا یہ حل نہیں تجویز فرمایا کہ گاڑیوں کو سڑکوں پر چلنے ہی نہ دیا جائے بلکہ سڑکوں کی توسیع اور ٹریفک کے انتظام کی بہتری کو اِس کا حل بتایا گیا۔ ایسے ہی غنڈہ گردی کو روکنے کے لئے بھی عورت کی آزادی کا خاتمہ اور قومی و رفاہی کاموں میں اس کی شرکت پر پابندی کوئی حل نہیں بلکہ اس کے لئے بھی دُوسرے ذرائع کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔

پھر مرد، عورت میں شرم و حیا کے پیمانے بھی الگ الگ ہیں۔ کتنے ہی جلسوں میں مقرّروں سے سُننے میں آیا کہ "چونکہ یہاں خواتین بھی ہیں اِس لئے یہ بات کہتے ہوئے شرم آتی ہے"۔ حالانکہ شرم کی بات بہرحال شرم کی بات ہوتی ہے خواہ عورتوں کے سامنے کہی جائے یا مردوں کے سامنے۔ ویسے یہ لفظ "شرم" کسی جذبۂ احترام سے نہیں بلکہ لاشعور میں چھپی ہوئی حاکمیت کے اقتضاء سے بولا جاتا ہے کیونکہ حاکم کو

محکوم کے سامنے بے تکلفی کی باتیں کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔

اِسی طرح ان دونوں طبقوں کی تعلیم کے سلسلے میں بھی عجیب اِمتیازی فلسفہ جھاڑا جاتا ہے۔ مرد کی تعلیم کا مقصد اچھّا شہری بننا، اصولِ جہانبانی سے واقف ہونا اور اپنے "نحیف و نزار کندھوں" پر قوم کی خدمت کا بوجھ اُٹھانے کے قابل ہونا بتایا جاتا ہے۔ یہ مقصد ہے تو بہت مُبارک، مگر اس کے ساتھ ایک اور اچھا سا لفظ شاید ہی کبھی سُننے میں آیا ہو وُہ یہ کہ مرد کی تعلیم کا مقصد ایک "اچھّا شوہر اور اچھا باپ بننا" بھی ہے جیسا کہ عورت کی تعلیم کا مقصد عموماً یہی بتایا جاتا ہے کہ وُہ ایک "اچھی بیوی اور اچھی ماں" بن سکے۔ شاید اِس تفریق کی وجہ یہ ہو کہ کہیں لوگ" اچھا شوہر اور اچھّا باپ" سے بھی وُہی معنی نہ سمجھنے لگیں جو وُہ "اچھی ماں اور اچھی بیوی" سے مُراد لیتے ہیں کیونکہ اپنے معاشرے کی راہ و رسم کے پیشِ نظر "اچھی بیوی اور اچھی ماں" کے معنی کچھ ایسے بنتے ہیں کہ وُہ چوبیس گھنٹے گھر کی چار دیواری کے اندر بند رہے، صبح و شام جھاڑو سے چمٹی رہے، ہانڈی چُولھے سے کسی وقت الگ نہ ہو، خاوند کے کپڑے جُوتے وغیرہ صاف رکھنا فرض سمجھے، جب وُہ کہیں باہر سے گھر پہنچے تو اُسے دابنے بیٹھ جاتے، خواہ مر رہی ہو مگر اُس کی خواہش سے مُنہ نہ موڑے، اس کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر قدم نہ رکھے۔ اپنی عقل کو شوہر کے قدموں پر نثار کر کے عقلی امُور سے دست بردار ہو جائے کیونکہ عورت کی بے عقلی کو بھی اس کے حُسن کا ایک حِصّہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ تمام عقلی امور مرد کے مقدر میں ہیں۔ عورت

کے نصیب میں تو محض اس کی اطاعت، خوشامد اور ہر حال میں وفاداری آتی ہے مگر مرد جب چاہے کوئی وجہ بتائے بغیر اُسے طلاق دے سکتا ہے، کسی علمی محفل میں شرکت، کسی ملکی خدمت میں حصّہ عورت کی قسمت میں نہیں۔ ملازمت کا نام لینا اس کے لیئے جرم ہے کیونکہ کمانا تو صرف مرد کا کام ہے، عورت کا کام تو بس اتنا ہے کہ جو کچھ مرد کما کر لائے یہ اس کی ہدایت کے مطابق اس میں تصرّف کرے۔

ویسے یہ بھی غنیمت ہے کہ اب عورت کو لکھنے پڑھنے کی اجازت تو مِل گئی خواہ "اچھی بیوی اور اچھی ماں" ہی بننے کے لیئے سہی کیونکہ پہلے تو اس میں بھی بڑا اختلاف تھا کہ عورت کے لیئے لکھنا پڑھنا جائز بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ اب بھی اِس اختلاف کی اِکّا دُکّا صدائے بازگشت کہیں کہیں سے سُننے میں آجاتی ہے مگر وُہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

جسمانی کمزوری اور عقلی نقصان

آج دُنیا کی بعض اقوام ترقی و کمال کے حیرت انگیز مقام پر پہنچ گئی ہیں۔ ان کی اِس ترقی کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب عورت کی آزادی اور مُساوی حیثیّت ہے۔ ان اقوام کے مرد عورت نے ایک دُوسرے کے شانہ بشانہ ملکی تعمیر و ترقی میں دن رات ایک کر دیئے تب کہیں جا کر یہ قابلِ رشک مقام حاصل کیا۔ ترقی پذیر اقوام ان تک رسائی حاصل کرنے کی تمنّا سے تو بہرہ ور ہیں مگر اس تمنّا کی تکمیل کے لیئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان سے تہی دامن بلکہ متنفّر ہیں۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے کوئی چھت پر تو چڑھنا چاہتا ہو مگر سیڑھی لگانے کا مخالف ہو۔ پس اگر ترقی یافتہ اقوام کے مقام تک رسائی حاصل کرنی ہے تو اس کے لئے عورت کو آزادی دے کر اُسے برابر کا شریکِ کار بنانا ہوگا۔ کیونکہ ہر ملک کی قریباً آدھی آبادی عورتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اِتنی بڑی اکثریت کو ایک بے کار عضو بنا کر ترقی یافتہ اقوام تک رسائی کا خیال ایک ایسا خواب ہے جو کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا کیونکہ ترقی یافتہ قومیں کسی خاص حد پر جا کر رُک تھوڑی ہی گئی ہیں کہ یہ چیونٹیوں کی رفتار سے چل کر بھی ان تک رسائی حاصل ہو جائے گی، بلکہ ان کے مرد عورت ایک دوسرے کے دوش بدوش ہر لحظہ آگے ہی بڑھ رہے ہیں۔ ان تک رسائی صرف یُوں حاصِل کی جا سکتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ ترقی پذیر اقوام کے مرد عورت قومی امور میں مساوی حیثیّت سے کام کریں بلکہ ترقی یافتہ اقوام سے کئی گُنا زیادہ محنت کریں۔

کہا جاتا ہے کہ عورت کو کِس طرح قومی امور میں شریکِ کار بنایا جائے جب کہ ایک تو وُہ اعضاء کے اعتبار سے کمزور، دوسرے عقلی اعتبار سے ناقِص، ایسے حال میں اس کی شرکت، کام بنانے کے بجائے بگاڑنے کا باعث ہوگی۔ اس کے متعلق گذارش یہ ہے کہ کیا سارے مرد طاقت کے لحاظ سے رُستم اور ذہن کے اعتبا سے افلاطون ہوتے ہیں کہ عورتوں کے برعکس ان کے لئے تمام امور میں شرکت کے مواقع اصولی طور پر مسلّم ہیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں، مردوں میں بھی کِتنے ہی

ایسے ہوتے ہیں جو اعضاء کے اعتبار سے کمزور اور عقل کے اعتبار سے ناقص ہیں
اسی طرح عورتوں میں بھی کچھ قوی اور ذہین ہیں اور بعض کمزور اور غبی۔ تو جس طرح
بعض افراد کی کمزوری کے سبب مردوں پر ترقی کی راہیں بند نہیں کی جاتیں عورتوں
پر کیوں پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ موجودہ دور میں مردوں کے مقابلے میں قوی اور ذہین عورتوں
کا تناسب کم ہے مگر اس کا باعث یہ نہیں کہ عورت کی فطرت[1] میں کوئی کمزوری ہے بلکہ
عورتوں میں بھی وُہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو بہ حیثیت انسان مردوں میں پائی جاتی
ہیں۔ اِس لئے کچھ عورتوں کی اعضاء اور عقلی اعتبار سے کمزوری کسی قسم کی انسانی
صلاحیتوں کے فقدان کے باعث نہیں بلکہ اس کا سبب قدرت کا یہ اٹل قانون
ہے کہ جس چیز کی صلاحیتوں سے کام لینا چھوڑ دیا جائے وُہ کمزور ہو جاتی ہے صدیوں
سے عورت پر محنت طلب کاموں اور عقلی امور میں قدم رکھنا ممنوع قرار دے دیا گیا۔
جس سبب وُہ آہستہ آہستہ اعضاء اور عقل کے اعتبار سے کمزور ہوتی چلی گئی اور
جو ذراسی کمی رہ گئی تھی اُسے دن رات کی اِس تشہیر نے پورا کر دیا کہ عورت پاگل ہے

---

[1] ویسے یہ فطرت کا لفظ بھی آج کل کے مظلوم ترین لفظوں میں سے ہے۔ کہنے کو تو اس
کے معنی "اٹل اور ابدی حقیقت" ہیں۔ مگر ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر وُہ رسم یا ہر وُہ عارضی
کیفیت جو چند ہنگامی اسباب سے پیدا ہو گئی ہو کچھ زمانہ گذرنے کے بعد ہمارے فضلاء
کے ہاں فطرت کہلانے لگ جاتی ہے۔ حسن

سودائی ہے، ناقص عقل والی ہے، کمزور اعضاء والی ہے۔ اِس پراپیگنڈہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت اِحساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی اور یہی خیال کرنے لگی کہ سچ مچ عقلی اور محنت طلب امُور صرف مردوں ہی کا حِصّہ ہیں عورت میں ان کے کرنے کی صلاحیّت نہیں۔

کتنی ستم ظریفی ہے کہ عورتوں میں بدنی و عقلی کمزوری والی عارضی کیفیّت خود مردوں کے جذبۂ تغلّب نے پیدا کی لیکن جب بھی کوئی اِنسانیت دوست مرد یا عورت، عورتوں کے مُساوی حقوق کا مطالبہ کرتا ہے تو اُسے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ عورت کمزور بدن اور ناقص عقل والی ہے۔ اِس لفظ کو ایسی معصُومیت سے دہرایا جاتا ہے جیسے یہ کمزوری کسی ناگہانی آفت سے پیدا ہو گئی ہو اور مرد کا اس میں کوئی قصور نہ ہو۔ حالانکہ بندۂ پرور یہ کمزوری آپ ہی کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے۔ ذرا اپنے قہر و جبر کی تلوار عورت کے سر سے ہٹا لیجئے پھر دیکھئے عورت کے جسم و عقل سے اس عارضی ضعف و نقصان کے بادل کس طرح چھٹتے ہیں۔

محکومی کی ابتدا،

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب شکار کا زمانہ ختم ہوا، اور اِنسان نے تہذیب و تمدّن میں قدم رکھتے ہوئے زرعی دَور کا آغاز کیا اُس وقت اس میں جذبۂ ملکیّت نے جنم لیا۔ پھر اس جذبہ کی شیرینی دِل کو گھیرتی ہی چلی گئی جس کے نتیجے میں مرد، عورت کا حاکم بن گیا۔ وُہ یُوں کہ عورت حیاتیاتی فریضہ کی سرانجام دہی میں کچھ عرصہ کے لیئے کام کاج سے معذُور ہو جاتی ہے۔

اِس دَور میں مرد اس کا سہارا ہوتا ہے۔ مرد نے عورت کی اِس مجبوری اَور اپنی بالادستی سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے ہُوئے تہذیب کے اِس ابتدائی دور میں جب کہ وُہ حیوانی سطح سے کچھ ہی بلند ہوا تھا عورت کی آزادی سلب کر لی۔ حیوانی سطحِ زندگی کا تقاضا ہی یہ ہوتا ہے کہ کسی کو ذرا سا کمزور پاتے ہی اس کے حقوق غصب کر لیئے جائیں۔

اِس نیم حیوانی سطحِ زندگی کے دَور میں عورت کی چند روزہ معاشی مجبوری کو مرد نے اپنے حیوانی جذبۂ تغلّب کے پیشِ نظر مستقل اِحتیاج میں بدل دیا۔ اکتسابِ رزق اَور حصولِ معاش کو اپنے ساتھ خاص کر لیا اَور عورت کو اس میں دخل کا موقعہ دیا بھی تو ایک مستقل فرد کی حیثیّت سے نہیں بلکہ محض ایک غلام کی حیثیّت سے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت کے اِختیارات چھن گئے، اس کی زندگی دُوسرے کے رحم و کرم پر موقوف ہو گئی۔ اس کی مُستقل حیثیّت ختم ہو گئی۔ اب اس کے فرائض میں یہ چیز داخل ہو گئی کہ ہر وقت مرد کا دل خوش رکھے، جس رنگ میں وُہ اُسے دیکھنا چاہے اسی رنگ کو اِختیار کرے۔ چنانچہ عورت بھی اپنی معاشی مجبوری اَور مرد کی خوشنودی و دلجوئی کی خاطر اپنی شخصیّت کو فنا کرنے اَور اپنے آپ کو دِلکش کھلونا بنانے پر آمادہ ہو گئی۔ مرد کی ہوس بڑھتی گئی اَور عورت بھی اسی سانچے میں ڈھلتی گئی۔ پھر کیا ہوا؟ مرد کی حیوانی خواہشات کے نہ ختم ہونے والے سِلسلے نے عورت کے ذہن سے یہ احساس ہی ختم کر دیا کہ وُہ جو ایک رنگین کھلونا بنی ہوئی ہے یہ اُس کی اصلی حالت نہیں بلکہ جبری کیفیّت اَور اس کے اِنسانی حقوق کی پامالی کا ایک ذلیل ترین نتیجہ ہے۔

صدیوں کی غلامی نے عورت کے لاشعور میں یہ بات بٹھا دی ہے کہ وُہ سچ مچ ایک حسین بھول، ایک رنگین کھلونا اور ایک سنہری گڑیا ہے۔ اس لاشعور نے عورت کے لباس، چال ڈھال اور آرائش میں طرح طرح کے انداز پیدا کئے جنہیں دیکھ کر واعظوں (مذہبی پیشواؤں اور سیاسی رہنماؤں) نے چلّانا شروع کیا کہ عورت آوارہ ہو گئی ہے، عُریاں لباس پہنتی ہے، غیر شریفانہ طور پر چلتی ہے، بے راہ روی کی شکار ہو گئی ہے۔ مگر یہ واعظ اپنے گریبان میں مُنہ ڈال کر کبھی یہ سوچنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے کہ یہ کیوں عُریاں ہو گئی، اُسے کس نے بے راہ رو بنایا؟ اگر یہ حضرات کبھی اِنصاف سے غور کریں تو ان کا ضمیر یہی جواب دے گا کہ بندہ پرور! یہ سب کچھ آپ ہی کی ہوسناکیوں کا نتیجہ ہے۔ عورت کو کھلونا سمجھنا چھوڑ دیجئے۔ اس کے پامال کردہ حقوق بحال کیجئے، اُسے معاشی آزادی دیجئے۔ اس کے روزی کمانے کے ذرائع پر سے پابندیاں ہٹا لیجئے۔ پھر دیکھیئے بے راہ روی ختم ہوتی ہے یا نہیں۔

عورت کو آزادی مِل کر رہے گی

یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ عورت کی محکومی و غلامی ختم ہو جائے گی اور اُسے بھی آزادی مِل کر رہے گی۔ کیونکہ اِس غلامی کی بُنیاد، حاکموں کی حیوانی سطحِ زندگی ہے جو عقلی شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ کمزور ہوتی چلی جا رہی ہے، مستقبل میں انسانیت کے اِرتقاء کی رفتار کافی تیز رہے گی اور اتنی ہی تیزی سے

حیوانی زندگی والی بنیاد منہدم ہوتی جائے گی جس سے اس پہ بنائی ہوئی "عورت کی غلامی" کی عمارت بھی دھڑام سے نیچے آگرے گی۔ پھر عورت آزاد ہو جائے گی اور اسے برابر کی حیثیت مل جائے گی۔ تاریخ کے اس دھارے کا جو بھی رجعت پسند طاقت مقابلہ کرے گی اُسے آخر کار ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑے گا کیونکہ تاریخ آگے ہی کو بڑھتی ہے، پیچھے کو نہیں لوٹتی۔ رجعت پسند اپنی اس مخالفت سے عورت کی غلامی کو دائمی تو نہیں بنا لیں گے تاہم حصُولِ آزادی میں تاخیر پیدا کر کے کتنی ہی مزید عورتوں کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگین ضرور کر لیں گے۔ اس لیے حقیقت پسند اور انسانیت دوست افراد کو مُہرِ سکوت توڑ کر میدان میں آجانا چاہیئے۔ اگر وہ جرأت سے کام لیں تو عورت کی مظلومی کی مدت کم کی جا سکتی ہے۔ اور لاکھوں جانوں کو تاریک گوشوں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر قبل از وقت جان دے دینے سے بچایا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ حیوانی اقتدار کے حامی آسانی سے اپنی حاکمیت ختم نہیں ہونے دیں گے بلکہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے حسب سابق جواز کی نئی نئی راہیں تلاش کریں گے۔ کبھی دھمکیوں سے کام لیں گے، کبھی فتووں کو آڑ بنائیں گے کیونکہ حیوانی اقتدار کا نشہ اور مظلوموں کے خونِ ناحق کا چٹخارہ انہیں ان سب حرکات پر مجبور کرے گا تاہم کامیابی خلقت کے بیرز کاروں ہی کے قدم چومے گی کیونکہ رجعت پسندی کے بادل آفتابِ حقیقت کے سامنے کبھی نہیں ٹھہر سکتے۔

ایک مشہور اعتراض

عورت کی آزادی کے خلاف عام طور پر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر عورت کو آزادی مِل گئی تو وُہ بے راہرو ہو جائے گی مگر اِس دلیل کو پیش کرتے وقت نہ جانے یہ حقیقت کیوں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہے کہ آزادی اِنسان کا پیدائشی حق ہے اور عورت بھی ایک اِنسان ہے۔ ان دو مقدموں کا نتیجہ واضح ہے کہ آزادی عورت کا پیدائشی حق ہے اور دُنیا کا ہر باشعُور اِس بات سے اِتفاق کرے گا کہ ہر شخص کو اُس کا پیدائشی حق مِلنا چاہیئے۔

اِنسان کے اسی پیدائشی حق کی حمایت ہی کا جذبہ ہے جس کے پیشِ نظر سامراجی ممالک کی مذمت اور محکوم ممالک سے ہمدردی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہی وُہ جذبہ ہے جس کے پیشِ نظر ہم کشمیر و فلسطین وغیرہ کے محکوم و مظلوم باشندوں کے زبردست حامی ہیں۔

مگر اَے کاش کبھی اِدھر بھی غور کر لیا ہوتا کہ جو پیدائشی حق ہم کشمیر، فلسطین اور دُوسرے ممالک کے محکوم باشندوں کو دِلانا چاہتے ہیں اسی پیدائشی حق سے (آزادیٔ مُلک کے بائیس سال بعد بھی) اپنے دیس کی آدھی آبادی محروم ہے۔ اسے مکمل طور پر یہ حق دلانے کے لئے کیوں کوشش نہیں کی جاتی۔ اور ان لوگوں سے کیوں تعاون نہیں کیا جاتا جو اِس مظلوم طبقے کو اس کا یہ جائز حق دلانا چاہتے ہیں۔

کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ آج عورت کی آزادی کے خلاف وہی پامال دلیل دُہرائی جاتی ہے جو انگریز متحدہ ہندوستان کی آزادی کے خلاف پیش کیا کرتے تھے۔ جب اُن سے کہا جاتا کہ ہندوستان کو آزاد کر دو تو وُہ جواب میں کہتے کہ ابھی برِّصغیر کے باشندوں میں حکومت کرنے کا شعور اَور ایک آزاد قوم کی حیثیّت سے زندہ رہنے کی صلاحیّت پیدا نہیں ہوئی اِس لئے اگر اُنہیں ابھی آزاد کر دیا گیا تو یہ بڑے نقصانات اٹھائیں گے۔ اس وقت ہمارے تمام مذہبی و سیاسی رہنما بجا طور پر انتہائی جھلّاہٹ سے کہتے تم ہمارے فائدے کے ٹھیکیدار تھوڑے ہی ہو، اپنی حاکمیّت کا جؤا ہماری گردنوں سے اُتار لو، ہم خود ہی اپنے فائدے نقصان کا سوچ لیں گے، تمہیں ہماری حمایت میں مگرمچھ کے آنسو بہانے کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہاری یہ حیلہ بازیاں اپنی حکومت کو دیرپا بنانے اَور ہمارا زیادہ سے زیادہ استحصال کرنے کا ذلیل ترین حربہ ہیں۔ اَور اگر بالفرض تم سچ مچ جذبۂ ہمدردی ہی سے یہ دلیل پیش کر رہے ہو تو بھی سنگین غلطی میں مبتلا ہو کیونکہ اگر تم نے ہمیں اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہونے دیا تو قیامت تک ہم میں مطلوبہ صلاحیتیں نہ پیدا ہو سکیں گی اَور ہم خود اعتمادی اَور اپنے اُوپر بھروسہ کی دولت سے کبھی بہرہ ور نہیں ہو سکیں گے۔ لہٰذا تم ہمارا پیچھا چھوڑو۔ ہم گرتے پڑتے اپنے قدموں پر پُوری طرح خود ہی کھڑے ہو جائیں گے۔

یہ جواب جو انگریز کی دلیل کے مقابلے میں پیش کیا جاتا تھا اگر گرامی قدر رہنما غور کریں تو آج یہی جواب عورت کی آزادی کے سلسلے میں، ان کی پیش کردہ دلیل کے جواب میں بھی دیا جا سکتا ہے کہ آپ اس غلامی کا طوق اس کی گردن سے اُتار دیجئے، اپنے اقتدار و حاکمیت کو برقرار رکھنے کے لئے حیلے بہانے نہ تراشئے، عورت کی ہمدردی میں مگرمچھ کے آنسو نہ بہائیے۔ اگر بالفرض آپ سچ مچ جذبۂ ہمدردی سے یہ دلیل پیش کر رہے ہیں تو بھی غلطی پر ہیں کیونکہ جناب کی اُنگلی کے ساتھ لگے رہنے سے عورت قیامت تک آزادی کے صحیح استعمال اور خود اعتمادی کی دولت سے بہرہ ور نہیں ہو سکے گی۔ آپ اُسے آزادی عطا کر دیجئے وُہ خود ہی گرتے پڑتے اپنا صحیح مقام حاصل کر لے گی۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ عورت کی آزادی اگر بے راہ روی کا باعث بنتی ہے تو یہ بے راہ روی آسمان کے فرشتوں کے ساتھ تو نہیں ہو گی بلکہ مرد کا بھی اس میں اتنا ہی حصّہ ہو گا جتنا عورت کا، تو پھر احتیاط کا سب نزلہ عورت پر کیوں گرنے لگا کہ اس کی آزادی چھین لی گئی۔ کیا یہ طرزِ عمل پکار پکار کر نہیں کہہ رہا کہ عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ جانوروں کے جہان میں تو

ع ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

مگر کیا انسانوں کی دُنیا میں بھی یہی اندھیر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مرد

کی آزادی سلب کرنا سخت ناروا ہے اسی طرح عورت کی آزادی چھیننا بھی سنگین جُرم ہے۔ مفروضہ بے راہ روی کا علاج کسی کے حقوق سلب کرنا نہیں بلکہ عمدہ تعلیم اور ذہنی و اخلاقی تربیت ہے۔

ہم کیا چاہتے ہیں؟

توہم پرستی اور غلط فلسفۂ زندگی نے ایک اِنسان کو دُوسرے اِنسان کے خون کا پیاسا بنا دیا ہے۔ خاندانی تعلقات سے لے کر بین الاقوامی تعلقات تک میں ہر جگہ غیر اِنسانی تصوّرِ حیات نے لرزہ خیز کارستانیوں کا ایک سلسلۂ دراز شروع کر رکھا ہے۔ چین و قرار عنقا ہے۔ امن و عافیت ناپید ہے، بے گناہوں کے خون سے در و دیوار رنگین ہو رہے ہیں۔ ایک طرف مظلوموں کا آہ و نالہ ہے دُوسری طرف سفّاکوں کے قہقہے ہیں۔ اُف! زندگیوں میں کس قدر بھیانک تفاوت ہے کہ کوئی وُہ ہے جسے اپنے جاں بلب بچّے کی دوا کے لئے چار پیسے میسّر نہیں۔ اور کوئی وُہ ہے جس کے کتّوں کے علاج پر سینکڑوں روپے اُڑ جاتے ہیں۔ ایک وُہ ہیں جن کی محرومیاں اَن گِنت ہیں اور ایک وُہ ہیں جن کا سامانِ عیش و طرب شمار سے باہر ہے۔ یہ سب کرشمہ سازی ہے اِنفرادیّت پرستی کے اِس ناپاک فلسفۂ حیات کی ہے جس نے اِنسان کو اِنسان کے لہُو کی چاٹ ڈال دی ہے ہمدردی مفقود ہو گئی ـــــ رواداری کا نام و نشان تک مِٹ گیا۔ ہر طرف ظلم وِ ستم، چھینا جھپٹی اور غنڈہ گردی کا دور دورہ ہو گیا جس سے یہ دُنیا اِنسانیت کے لئے جہنّم کا نمونہ پیش کرنے لگی۔

ہم چاہتے ہیں کہ دُکھوں اَور غموں سے بھری ہوئی یہ دُنیا خوشیوں اَور مسرّتوں کا گہوارہ بن جائے۔ یہاں خوُں ریزی کی بجائے امن ہو، نفرت کی بجائے محبّت ہو، ظلم کی بجائے اِنصاف ہو۔ آہوں کی بجائے مسکراہٹیں ہوں اَور چیخوں کی بجائے قہقہے ہوں۔

یہاں کسی ظالم کا ہاتھ مظلوم کے گریبان تک نہ پہنچ سکے، کوئی کسی کا اِستحصال نہ کر سکے، کوئی کِسی کا سُہاگ نہ لُوٹ سکے۔ کوئی کسی کو یتیم نہ بنا سکے، کوئی کسی کے گلشنِ ہستی کو سپردِ خزاں کر کے جشنِ بہاراں نہ منا سکے، کوئی کِسی کی لاش پہ اپنی زندگی کی عمارت نہ تعمیر کر سکے۔

ہم چاہتے ہیں کہ فٹ پاتھوں پر تڑپتے ہوئے غریب، تاریک گوشوں میں کراہتے ہوئے بے کس بیمار، اپنے خونِ رنگین سے سر بہ فلک کوٹھیوں کو حُسن بخشنے والے مگر خود جھونپڑے تک کو ترسنے والے محنت کش، مِلّوں میں زربفت و کمخواب بُننے والے مگر خود کھدّر کے دو کپڑوں تک سے محرُوم پارچہ باف، اپنے خُونِ جگر سے کارخانہ داروں کی تجوریاں بھرنے والے مگر خود پیسے پیسے کو ترسنے والے مزدُور، اپنا خون پسینہ ایک کر کے زمینداروں کے گھر غلّے سے بھرنے والے مگر خود نانِ شبینہ تک کے محتاج کسان اس بے کسی کے منحوس سائے، اس ظُلم کی ناپاک چکّی اَور اس درندگی کے خونیں پنجے سے رہائی پالیں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہر مُضطرب کو اِطمینان، ہر مریض کو دوا، ہر بھوکے کو

روٹی، ہر ننگے کو کپڑا اور ہر بے گھر کو گھر مل جائے۔

دوستو! آؤ سب مل کر امن و عافیت اور مسرت و اطمینان بخشنے والا نظامِ خُلت رائج کریں تاکہ یہ دُنیا جو دُکھوں اور مصیبتوں کی آماجگاہ ہو چکی ہے خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بن جائے۔

تعمیرِ وطن

تاسیسِ وطن کی طرح تعمیرِ وطن کا مرحلہ بھی بہت دشوار ہوتا ہے اس کے لیئے انتہائی جرأت، بے باکی، ایثار، بے لوثی اور بے پناہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈراوے، دھمکاوے، حرص و آز اور طمع و لالچ کی موجوں سے ٹکرائیے اور اجتماعی مفاد کے مقابلے میں انفرادی مفاد کی قربانی دیئے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔

تعمیرِ وطن کے پاکیزہ نصب العین کی تکمیل کے لیئے استحصالی نظام کا ڈھانچہ بدلنا اور اس میں اہم تبدیلیاں بروئے کار لانا ضروری ہے۔ چند اہم اور بنیادی نکات یہاں پیش کیئے جاتے ہیں۔

۱۔ ارتکازِ دولت کی روک تھام

مملکتِ پاکستان بارہ کروڑ باشندوں کا دیس ہے۔ مادرِ وطن کی آغوش اپنے سب فرزندوں کے لیئے یکساں طور پر کھلی ہوتی ہے، اس کی نعمتوں کے سبھی حقدار ہیں۔ پاک وطن کی نگاہوں میں سبھی افراد یکساں ہیں پھر یہ دھاندلی کیوں کہ اس کی دولت چند خاندانوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ گئی؟ یہ نابرابری خون آشام نظامِ سرمایہ داری اور چند غاصب سرمایہ داروں کے کرتوتوں

کا شاخسانہ ہے۔ کس قدر حیرت کی بات ہے کہ ہمارے ہاں کے صاحب اقتدار حضرات خود اِس دھاندلی کا اعتراف کرتے ہیں مگر اس کے اِنسداد کا کوئی بندوبست نہیں کرتے محض پیغمبرانہ انداز میں سرمایہ داروں کو وعظ و نصیحت کرنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اَے مہربانو! غریبوں کا خون نہ پیو، مزدُوروں کو نہ ڈسو مگر جو سرچشمہ یعنی نظامِ سرمایہ داری اِنسانوں کے رُوپ میں زہریلے ناگ پیدا کر رہا ہے اُسے بند کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

نہ جانے برسرِ اقتدار حضرات کی نگاہوں سے یہ حقیقت کیوں اوجھل ہو جاتی ہے کہ جب ایک طبقہ کو آقا بنا دیا جائے، اُسے دُوسروں کو ڈسنے کی بے پناہ طاقت دے دی جائے، اُسے دولت کے خزانوں پر ناگ بنا کر بٹھا دیا جائے اَور اُسے بڑے بڑے پیداواری ذرائع کا مالک بنا دیا جائے تو وُہ غریبوں کا خُون چُوسنے سے باز نہیں آسکتا بلکہ موقع بہ موقع ضرور ڈنگ مارتا رہے گا۔ ہزار احتیاطوں کے باوجود وُہ ضرور کسی نہ کسی وقت درندگی کا مظاہرہ کرے گا۔ اِس حقیقت کو ایک سپیرے نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا، آج سے تقریباً بائیس برس پہلے کی بات ہے میں نے ایک سپیرے کو دیکھا جو ایک گلی میں بین بجا رہا تھا بچّوں نے اُسے کہا سانپ دکھاؤ تمہیں روٹی لا کر دیں گے۔ سپیرا بیٹھ گیا۔ اس نے پٹاری سامنے رکھ لی اَور بین بجانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پٹاری کا ڈھکن اٹھایا ڈھکن اُٹھتے ہی پٹاری میں بیٹھا ہوا سیاہ ناگ پھن پھیلائے بین کی آواز پر

جھومنے لگا۔ کچھ دیر بعد سپیرے نے بین بجانی بند کر دی اور سانپ کو پھن سے پکڑ کر اُٹھا لیا۔ میں سہم گیا، کہیں اسے کاٹ ہی نہ لے مگر سانپ نے اُسے کچھ نہ کہا، اس کے بازُو کے گرد بل کھاتا رہا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پُوچھ ہی لیا میاں سپیرے! یہ تمہیں کاٹتا نہیں؟ اُس نے کہا میں نے اِس کے دانت توڑ دیئے ہیں۔ میں نے پھر سوال کیا۔ تم سانپوں کا منتر جانتے ہو تمہیں اس کے دانت توڑنے کی کیا ضرورت پڑی، اسے پٹاری سے نکالنے سے پہلے کڑا بھر لیتے۔ پھر یہ تمہیں کچھ نہ کہہ سکتا۔ اس نے کہا صاحبزادے! جب تک اِس ناگ کے مُنہ میں ہمیں ڈسنے والے دانت موجُود رہیں ہم ہزار منتروں کے کڑے بھریں یہ موذی کسی نہ کسی وقت ڈس ہی جاتا ہے اِس لئے بہترین طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔ آج بائیس برس گذر چکے ہیں جب بھی اِس واقعہ کو یاد کرتا ہُوں بے ساختہ دل پکار اُٹھتا ہے سپیرے! تو نے سچ کہا تھا ہزار منتروں کے کڑے بھریں یہ مُوذی کسی نہ کسی وقت ڈس ہی جاتا ہے۔ اِس لئے بہترین طریقہ صرف یہی ہے کہ اس کے دانت توڑ دیئے جائیں۔ اِسی طرح آج بھی قانون اور پند و نصائح کے ہزار کڑوں کے باوجود سرمایہ داری کے پیدا کردہ ناگ موقع پا کر ڈس ہی جاتے ہیں۔ اِس لئے بہترین علاج یہی ہے کہ ان کے دانت توڑ دیئے جائیں اور تمام بڑے بڑے پیداواری ذرائع ان کی شخصی ملکیت سے چھین لئے جائیں تاکہ وُہ عوام کا خون نہ چُوس سکیں اور ملک کی

دولت سے محض چند خاندان ہی نہیں بلکہ بارہ کروڑ باشندے فائدہ اُٹھا سکیں۔

۲۔ اتفاقی تونگری کی روک تھام

یہ حقیقت ہے کہ زندگی مسرّت و اطمینان کا دوسرا نام ہے۔ جس سماج میں مسرّت و اطمینان ناپید ہو جائے وُہ زندگی کی ضد بن جاتا ہے۔ اِتفاقی دولت مندی وُہ زہرِ قاتل ہے جو پُورے معاشرے کو مسمُوم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس سے اطمینان کی نعمت عنقا ہو جاتی ہے۔ اِتفاقی تونگری کی متعدّد صورتیں ہیں۔ مثلاً اتفاق سے کسی پر عنایاتِ خسروانہ کی بارش برس پڑے اور دُوسرے ترستے رہیں۔ یا جُوئے کی طرح کوئی ایسا سِلسلہ شروع کر دیا جائے۔ جس سے محض اتفاق کی بنا پر ہزاروں میں سے کسی ایک کے وارے نیارے ہو جائیں اور دُوسرے اپنے جگر تھامے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر شخص یک لخت دولت مند بننے کے خواب دیکھنے لگتا ہے جس سے پُورا معاشرہ ایک تباہ کُن کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے اور بہت سی معاشرتی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں جیسے رشوت، غبن، غیر قانونی درآمد برآمد، چوری وغیرہ

۳۔ مستقبل کا تحفظ

ریاست کی تشکیل کے محرّکات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فرد اپنے حال اور مستقبل کو محفوظ اور مطمئن بنانا چاہتا تھا، اس کی تمنا تھی کہ میں باعزّت طور پر جیوں اور ہر وقت لاٹھی سے انصاف چاہنے کی بجائے عقل و قانون سے اِنصاف چاہوں، میں کام سے معذور ہو جاؤں

تو میرے علاج اَور معاش کا کوئی اِنتظام ہو، میرے مرنے کے بعد میرا خاندان بھُوکوں نہ مرے، مجھ پر کسی طاقتور کی طرف سے زیادتی ہو تو کوئی دروازہ کھٹکھٹا سکوں ان محرّکات نے فرد میں اِجتماعیّت کا شعور پیدا کیا چنانچہ پہلے قبائلی زندگی نے اَور بعد میں ریاست نے جنم لیا جس میں بسنے والے تمام افراد ایک وحدت میں پروئے ہوتے ہیں۔

ان محرّکات کی روشنی میں ہر ریاست کا یہ فرض ہے کہ اپنے تمام باشندوں کی معاشی ضروریات مہیّا کرے، ان کو یہ اِطمینان دلائے کہ وُہ ظلم وسِتم سے محفوظ رہیں گے، کوئی ان کا اِستحصال نہیں کر سکے گا، کوئی ان کی عزت وناموس پر ہاتھ نہیں ڈال سکے گا، کوئی ان کے حقوق غصب نہیں کر سکے گا۔ حکومت کا فرض ہے کہ ان کے لئے علاج معالجہ اَور تعلیم کا ایسا نظام قائم کرے کہ ہر شخص کو خواہ وُہ معاشرہ کے کسی بھی طبقہ سے تعلق رکھتا ہو اِس بنیادی ضرورت سے فائدہ اُٹھانے کے یکساں طور پر مواقع حاصل ہوں۔

نظمِ مملکت اس طور پر استوار ہونا چاہیئے جس میں ہر فرد کو یہ اِطمینان حاصل ہو کہ اس کی کسی بھی معذوری کی صورت میں اُسے اپنی بنیادی ضروریات کے لئے ترستا نہیں پڑے گا، اس کے فوت ہو جانے کی صورت میں اس کے بچوں کو دربدر کی ٹھوکریں نہیں کھانی پڑیں گی بلکہ حکومت کی طرف سے ان کے لئے بھی ہر قسم کی سہُولتیں میسّر ہوں گی اَور زندہ باپوں والے بچّوں کی طرح ان پر بھی

ترقی کی تمام راہیں کھلی ہوں گی۔

یہ حقیقت ہے کہ سرمایہ داری کے اِنسانیت کُش نظام میں اجتماعی شعور سُکڑ جاتا ہے اور انفرادیت پسندی اپنی اِنتہا کو چھُونے لگتی ہے۔ لوگ صرف اپنے اور اپنے عزیزوں کے مستقبل کی فکر میں گھُلنے لگتے ہیں اور مستقبل کے تحفّظ کی خاطر ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت بٹورنے لگتے ہیں جس سے ہر طرف اِستحصال اور لُوٹ مار کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ اگر حکومت اپنے فرضِ منصبی کو پہچانے اور سب لوگوں کو ان کے مستقبل کے تحفّظ کا یقین دلا دے تو اجتماعیت پسندی اور انفرادیت پسندی میں ایک عمدہ توازن پیدا ہو جائے گا جس سے معاشرہ لُوٹ کھسوٹ اور ظلم و ستم کی بجائے اِنصاف، مساوات اور ہمدردی و رواداری کی راہ پر چلنے لگے گا۔

۲۔ ذرائع پیداوار کی ملکیّت

فرد کی آزادی بڑی مقدّس چیز ہے۔ اِنسانیت کی بقا اور ذہنِ انسانی کے ارتقاء کے لئے اس کا وجود بنیادی شرط ہے اِس لئے وُہ تمام امور جن کا تعلق فرد کی آزادی سے ہے انہیں قائم رکھنا بھی لازم ہے۔

آزاد معیشت ہی فرد کی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے۔ ظالمانہ کلیّت پسندی جیسی کہ اِشتراکی ممالک میں رائج ہے شخصی آزادی کی دُشمن ہے۔ اِنسان کسی بے جان مشین کا پُرزہ نہیں بلکہ وُہ ایک جاندار اور عقل والی مخلوق ہے اِس لئے اس کے

ساتھ اس کے شایانِ شان سلوک ہونا چاہیئے۔ اُسے ایک مناسب حد تک شخصی ملکیت کا حق حاصل رہنا چاہیئے، بنیادی انسانی حقوق کے متعلق اُسے تحفظ حاصل ہونا چاہیئے، اظہارِ رائے کی اُسے آزادی ہونی چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اختلاف رائے کی بنا پر اُسے بنیادی حقوق تک سے محروم کر دیا جائے جیسا کہ اشتراکی ممالک میں بڑے وسیع پیمانے پر ہو رہا ہے۔ مگر آزاد معیشت سے میری مراد بے لگام معیشت نہیں جیسی کہ سرمایہ دار ممالک میں رائج ہے۔ اِس نظام میں جو چند افراد اتفاقی طور پر یا اپنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر آگے بڑھ جاتے ہیں وُہ دوسروں کا خون چُوسنے لگتے ہیں۔ ادھر حکومت ایک تماشائی ہی نہیں بلکہ بے لگام معیشت کے محافظ و مددگار کا کردار ادا کرنے لگتی ہے۔

اِس حقیقت سے کون بے خبر ہے کہ تمام افراد اپنی صلاحیتوں میں یکساں نہیں ہوتے۔ کچھ ذہین ہوتے ہیں کچھ غبی، کچھ طاقتور ہوتے ہیں کچھ کمزور۔ یہ حکومت کا فرض ہوتا ہے کہ ان کے حقوق میں عدل و مساوات کے تقاضے پُورے کرے اَور کسی فرد کو دُوسرے پر ظلم کا موقع نہ دے۔ ظلم صرف یہی نہیں ہوتا کہ کسی کا سر پھوڑ دیا جائے، ظلم یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کی محنت کا اِستحصال کیا جائے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں مزدوروں کی محنت کا بڑے وسیع پیمانے پر استحصال ہوتا ہے۔ چند افراد بڑے بڑے ذرائع پیداوار کے مالک بن جاتے ہیں اَور ہزاروں لاکھوں اِنسانوں کی قسمت اپنے دامن سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ مزدور بے چارے

تو اپنی انتہائی بُنیادی ضرورتوں تک کو ترستے ہیں جب کہ سرمایہ دار، کارخانہ داران غریبوں کی پیدا کردہ دولت سے عیّاشیاں کرتے ہیں۔

کسان اپنا خون پسینہ ایک کر کے مٹی سے سونا اگاتے ہیں مگر اس سونے سے محل زمینداروں کے تیار ہوتے ہیں۔ اِس دور کے کسان کی حالت مزدُور سے بہت ابتر ہے۔ مزدُوروں کی اکثریّت شہروں میں ہوتی ہے، پھر ایک ایک کارخانے میں کئی کئی ہزار ہوتے ہیں اس لئے انہیں اجتماع کے مواقع مل جاتے ہیں اور وُہ اپنی آواز مؤثّر طور پر اونچے ایوانوں میں پہنچا سکتے ہیں جب کہ کسان دیہاتوں میں ہوتے ہیں اور اگرچہ تعداد تو ان کی بھی بہت زیادہ ہے مگر مختلف رقبوں میں بِکھرا ہوا ہونے کے سبب مظالم کے خلاف ان کی آواز کم ہی بلند ہوتی ہے اور ہو بھی تو چنداں مؤثّر ثابت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے زمیندار کسانوں پر جس قدر ظلم ڈھاتے ہیں اس قدر کارخانہ دار مزدُوروں پر نہیں ڈھا سکتے۔ کسانوں کی تو عزّت و آبرو تک زمینداروں سے محفوظ نہیں ہوتی۔ مقامِ مسرّت ہے کہ مزدُور بیدار ہو چکے ہیں اور کسان بھی انگڑائی لے رہے ہیں۔ اب لوٹ کھسوٹ زیادہ دیر نہیں چل سکے گی۔

اربابِ حکومت کو یہ چیز ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ معاشرتی امن اور اِنسانی فلاح کے تقاضے جبھی پُورے ہو سکتے ہیں کہ تمام بڑے بڑے ذرائع پیداوار کی شخصی ملکیّت ختم کر دی جائے تاکہ کوئی سرمایہ دار، کارخانہ دار کسی مزدور پر اور کوئی

زمیندار کسی کسان پر ظلم نہ کر سکے۔ بے لگام معیشت کے حامیوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ آزادی چونکہ ہر فرد کا پیدائشی حق ہے اِس لئے زندگی کے میدان میں ہر شخص اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا پورا پورا حق رکھتا ہے۔ اب اگر کوئی ذہین شخص ترقی کر کے بڑے سے بڑا کارخانہ لگا لیتا ہے جس میں ہزاروں مزدور کام کرتے ہیں تو یہ اس کا حق ہے، اِس میں مداخلت آزادیٔ فرد کے منافی ہے میں کہتا ہوں یہ ایک مغالطہ ہے، ہر فرد کی آزادی کا دائرہ وہیں تک ہے جہاں سے دُوسرے کی آزادی شروع ہوتی ہے۔ اگر اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کے بہانے دُوسرے کی حد میں ایک قدم بھی رکھا گیا تو یہ آزادی نہیں ظلم ہوگا۔ دیکھئے انسان میں ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی طاقتیں موجود ہیں۔ اگر کوئی بڑا طاقتور پہلوان ہر راہ چلتے کو پکڑ کر پٹخنے لگے تو کیا اُسے یہ کہہ کر کھُلی چھُٹی دے دی جائے گی کہ اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا اس کا حق ہے اور اس حق پر پابندی آزادی کے منافی ہے؟ نہیں ایسا نہیں کیا جائے گا۔ کیونکہ پہلوان کی آزادی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وُہ دُوسروں کی آزادیاں چھینتا پھرے۔ اِسی طرح کسی ذہین آدمی کی آزادی کا بھی یہ مطلب ہرگز نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کو غریبوں کا خُون چُوسنے کی کھُلی چھٹی مِل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح جسمانی طاقت کو کسی پر ظلم کے لئے استعمال کرنا جرم ہے اِسی طرح ذہنی طاقت کو ظلم کا ذریعہ بنانا بھی سراسر جُرم ہے۔

مسابقت میں اعتدال مسابقت کا مطلب ہے ایک دُوسرے سے آگے

بڑھنے کے جذبے کے تحت کام کرنا۔ دو شخص جب ایک ہی طرح کا کام کرتے ہیں تو ہر ایک کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ میں دُوسرے سے بڑھ جاؤں۔ اس کے نتیجے میں کام کا معیار بڑھ جاتا ہے۔ جب دو گھوڑے ایک دُوسرے کے مقابلے میں دوڑتے ہیں تو ہر ایک دُوسرے سے آگے نکل جانے کے لئے جان توڑ کوشش کرتا ہے جس سے اس کی رفتار بڑھ جاتی ہے مگر اکیلا دوڑنے کی صورت میں اس کی رفتار میں مقابلے کی دوڑ جیسی تیزی نہیں پیدا ہوتی۔

حیوانوں میں شعور نہیں ہوتا (یعنی بہت ناقص ہوتا ہے) وُہ کسی کام کی اہمیّت و افادیّت کا اندازہ نہیں کر سکتے اس لئے ان سے لیئے جانے والے کام کی مقدار و معیار میں اضافہ کرنے کے لئے ان پر خارجی دباؤ ڈالنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کی دو صُورتیں ہو سکتی ہیں یا تو انہیں چابک مارے جائیں یا اُن میں مقابلہ کرا دیا جائے۔ مگر انسان کا شعور بہر حال حیوانی سطح سے بلند ہے۔ اِس لئے اِنسانیت کے شایانِ شان یہ امر ہے کہ اِنسان جب کسی کام کو سرانجام دینے لگے تو اِس کام کی اہمیّت و افادیّت ہی اسے سر توڑ کوشش پر ابھارے نہ کہ سزا کا خوف یا دُوسروں کی رِیس یا مقابلہ۔

یہ درست ہے کہ ابھی ہمہ گیر سطح پر اِنسانی شعُور اِتنی ترقی نہیں کر پایا کہ ہر فرد محض کسی کام کی اہمیّت و افادیّت ہی کو سامنے رکھ کر محنت کرے۔ اِس لئے مجھے اِس سے اِنکار نہیں کہ ابھی کسی حد تک اِنسان کے لئے مسابقت کی ضرورت ہے

مگر یہ طرزِ عمل کسی طرح قابلِ ستائش نہیں کہ وسیع پیمانے پر مسابقت کی حوصلہ افزائی کر کے اِنسانوں کو حیوانیت کے مقام سے قریب تر کیا جائے بلکہ لازم یہ ہے کہ اِنسانوں کے شعور کو اعلیٰ تعلیم اور اچھے معاشرے کے ذریعے اِس قدر بلند کر دیا جائے کہ ہر فرد کسی کام کو صرف اس جذبے سے سر انجام دینے لگے کہ یہ کام بہت اہم اور نوعِ انسان کے حق میں بے حد مفید ہے، نہ اس خیال کے تحت کہ چونکہ دوسرا فرد بھی یہ کام کر رہا ہے لہذا مجھے بھی کرنا چاہیئے تاکہ اس سے بڑھ جاؤں یا پیچھے نہ رہ جاؤں کیونکہ یہ ریس اور مسابقت ممکن ہے جزوی طور پر کام کے معیار اور مقدار میں تو کچھ اضافہ کر دے لیکن اِنسانی کردار اور اِنسانی شعور کو گھن کی طرح چاٹ جائے گی اور انجام کار کام کی مقدار بھی انتہائی کم اور معیار بھی انتہائی پست ہو جائے گا۔ کیونکہ خارجی دباؤ خواہ ریس کی شکل میں ہو یا مسابقت کے انداز میں انسان سے فرض شناسی کا جوہر ختم کر دیتا ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ ابھی کسی حد تک اِنسانیت کے لئے مسابقت کی اِحتیاج موجود ہے مگر ضرورت اِس بات کی ہے کہ اس میں توازن و اعتدال پیدا کیا جائے۔ سرمایہ داری نظام میں مسابقت، اعتدال سے محروم ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مقابلہ کے دوران بڑے بڑے سرمایہ دار چھوٹے سرمایہ داروں کو ہڑپ کر جاتے ہیں۔ بڑے کارخانے چھوٹے کارخانوں کو ہضم کر لیتے ہیں جس سے دولت چند ہاتھوں میں اکٹھی ہو کر امیر و غریب کے درمیان بہت بڑی خلیج حائل کر دیتی ہے۔ اِس بات

کی پوری کوشش ہونی چاہیئے کہ مسابقت صرف بقدرِ ضرورت ہی باقی رکھی جائے۔ اَور ایسے ذرائع اِختیار کئے جائیں جن سے بتدریج ہر فرد میں اِحساسِ فرض پیدا ہو جائے اَور حیوانیّت کے اِس ورثہ یعنی مسابقت سے اِنسانیّت رہائی پالے۔

فہرست

پیشکش

حزبِ خلیل پاکستان

مطبوعہ:- دین محمدی پریس لاہور